ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک اہم خطاب

کیا پاکستان میں ایرانی طرز کا انقلاب ممکن ہے…

وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی

۳۶ کے ماڈل ٹاؤن — لاہور

Siddiq Sons Industries Ltd.

Largest Manufacturers & Exporters of :

WATERPROOF COTTON CANVAS, TARPAULINS, TENTS, WEBBING AND OTHER CANVAS PRODUCTS,

HEAD OFFICE :

709, 7TH FLOOR, QAMAR HOUSE,
M.A. JINNAH ROAD, KARACHI (PAKISTAN)

2 - K GULBERG II, SHAHRAH-E-IQBAL, LAHORE.
TELEPHONE : 870512 880731

لائبریری
قرآن اکیڈمی کراچی
7/16/36

ماہنامہ
میثاق
لاہور

جلد ۳۴ | جنوری ۱۹۸۵ء مطابق ربیع الثانی ۱۴۰۵ھ | شمارہ ۱

مشمولات

عرض احوال ——— ۳
جمیل الرحمٰن
تذکرہ و تبصرہ ——— ۵
ڈاکٹر اسرار احمد
کیا پاکستان میں ایرانی طرز کا انقلاب ممکن ہے؟ ۱۳
ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک خطاب
ڈاکٹر اسرار احمد کی اپیل اور علماء دیوبند ۵۱
مولانا سید اخلاق حسین قاسمی
مسئلہ رجم ——— ۶۱
مولانا سید حامد میاں مدظلہ
کل بدعۃ ضلالۃ ——— ۶۹
محمد یونس جنجوعہ
شام الہدیٰ ——— ۷۵
نعیم الطاف
رفتار کار ——— ۸۱

ادارۂ تحریر
شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید

سالانہ زر تعاون
۳۰ روپے
قیمت فی شمارہ
۳ روپے

ناشر
ڈاکٹر اسرار احمد
طابع
چودھری رشید احمد
مطبع
مکتبہ جدید شارع فاطمہ جناح لاہور

مکتبہ تنظیم اسلامی
فون: ۸۵۲۶۱۱

- سب آفس: ۱۱ داؤد منزل نزد آرام باغ، شاہراہ لیاقت کراچی

کراچی فون برائے رابطہ
۲۱۴۷۰۹

قارئین "ماہنامہ میثاق" اور "ماہنامہ حکمتِ قرآن" متوجہ ہوں!

تحریکِ تجدیدِ ایمان - توبہ - تجدیدِ عہد اور دعوت رجوع الی القرآن کے یہ دونوں نقیب و ترجمان پاکستان میں حسبِ ذیل پتوں سے مل سکتے ہیں۔ نیز جدید سالانہ خریداری کے اجراء یا قدیم سالانہ خریداری کی تجدید کے لئے سالانہ زرِ تعاون بھی ان مقامات پر جمع کرایا جاسکتا ہے۔

کراچی: دفتر تنظیم اسلامی کمرہ علا، داؤد منزل، نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت۔
شائننگ ٹریڈرز، رنیع مینشن بالمقابل آرام باغ شاہراہ لیاقت فون ۲۱۴۷۰۹۔

نوٹ: ان دونوں مقامات سے محترم ڈاکٹر صاحب کے دروس و خطاب کے کیسٹ بھی مل سکتے ہیں۔

پشاور: دفتر تنظیم اسلامی۔ نثار بلڈنگ پل پختہ نزد چوک یادگار پشاور۔
ملتان: عبدالغنی صاحب، ملتان پولٹری کارنر، بالمقابل فاطمہ جناح ہسپتال ملتان - فون ۷۵۸۹۱۔
کوئٹہ: دفتر تنظیم اسلامی جناح روڈ کوئٹہ اور قاری افتخار احمد صاحب خطیب مسجد طوبیٰ مسجد روڈ کوئٹہ فون نمبر ۷۷۲۶۵۔
راولپنڈی: فیری لینڈ اسکول ۱-بی - ۱۴۸ راولپنڈی سٹلائٹ ٹاؤن فون ۴۳۷۳۶۔
گوجرانوالہ: جناب پاشا ہاردن، بی کی، بی - ۵۸۱ - سٹلائٹ ٹاؤن۔
سیالکوٹ: (ریٹائرڈ کمانڈر) محمد طفیل صاحب مکان نمبر ۲۲۸ عزیز بھٹی روڈ سیالکوٹ کینٹ۔
دہاڑی: راؤ محمد جمیل سینٹری انسپکٹر میونسپل کمیٹی دہاڑی۔
ایبٹ آباد: خالد وحید صاحب سی - ۹۴۷ اسول لائنز۔ فون نمبر ۲۳۰۳، ۴۴۲۹۔
فیصل آباد: دفتر تنظیم اسلامی، بالمقابل گورنمنٹ رحمانیہ ہائی سکول درمکان حاجی عبدالواحد قیم تنظیم پیپلز کالونی فون نمبر ۴۳۱۴۰۹۔
سوات: فلک سیر کارپوریشن - جی ٹی روڈ، منگورہ۔
اسلام آباد: بسم اللہ خان صاحب بی /۲۷۸ II / 6 G۔
حویلی لکھا: محمد امین صاحب نزد مرکزی جامع مسجد مین بازار۔

"میثاق اور حکمتِ قرآن" ہر دو کا علیحدہ علیحدہ سالانہ زرِ تعاون اندرونِ ملک -/۳۰ روپے ہے جبکہ دوسرے ممالک کے لئے زرِ تعاون حسبِ ذیل ہے:

- کینیڈا -/۱۵۰ روپے یا ۱۵ کینیڈین ڈالر۔
- امریکہ، افریقہ، مغربی جرمنی، نائیجیریا -/۱۵۰ روپے یا ۱۲ امریکن ڈالر۔
- انگلینڈ، ناروے، متحدہ عرب امارات -/۱۰۰ روپے یا ۱۰ امریکن ڈالر۔
- سعودی عرب، ابوظہبی، مصر، ایران -/۶۰ روپے یا ۶ امریکن ڈالر۔
- انڈیا -/۵۰ روپے، یا ۵ امریکن ڈالر۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جمیل الرحمٰن

عرضِ احوال

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

بحمد اللہ وعونہٖ ’ماہنامہ میثاق‘ کے اس شمارے بابت جمادی الاوّل ۱۴۰۵ھ مطابق جنوری ۱۹۸۵ء سے چونتیسویں جلد کا آغاز ہو رہا ہے۔ دعوتِ اسلامی کا یہ نقیب اس دوران مختلف نشیب و فراز سے گزرا ہے۔ ایسا وقت بھی آیا ہے کہ اس کی اشاعت کچھ عرصہ تک معطل رہی ہے اور اسے اس دور سے بھی سابقہ پیش آیا ہے کہ بعض اوقات دو دو اور تین تین ماہ کے شمارے یکجا شائع ہوئے ہیں۔ پھر اس کی اشاعت بھی محدود رہی ہے۔ لیکن بفضلہٖ تعالیٰ وسبحانہٗ چند سال قبل سے جہاں اس کی اشاعت میں باقاعدگی ہوئی ہے وہاں اس کی تعدادِ اشاعت میں بھی قابلِ لحاظ اضافہ ہوا ہے اور الحمد للہ والمنّۃ اس کا حلقہ بتدریج وسیع ہو رہا ہے۔

’میثاق‘ کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہٗ امیر تنظیم اسلامی کے خطاباتِ جمعہ اور دروس کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہے۔ امیر محترم ہر جمعہ کو مسجد دارالسلام باغ جناح لاہور میں قریباً سوا گھنٹے کا خطاب ارشاد فرمایا کرتے ہیں الّا یہ کہ موصوف کسی دعوتی دورے پر لاہور سے باہر تشریف لے گئے ہوں — ان خطابات میں سے چند اہم خطابات کیسٹ سے منتقل کر کے ’میثاق‘ میں شائع کرنے کا اہتمام ہوتا ہے۔ کسی تقریر کو تحریری شکل دینا کتنا مشکل کام ہے اُسے وہی حضرات بخوبی جان سکتے ہیں جن کو اس کا ذاتی تجربہ ہو۔ تقریر میں عموماً خطاب کا رُخ بھی بدلتا رہتا ہے اور صیغہ خطاب بھی لہٰذا انتہائی احتیاط اور کوشش کے باوجود اس ’منتقلی‘ میں جھول اور بے ربطی رہ جاتی ہے چنانچہ ہمیں اعتراف ہے کہ بعض اوقات یہ بے ربطی ہمارے قارئین کرام کے ذوق پر گراں گزرتی ہوگی۔ اس کے لئے ہم صدقِ دل سے ان کی خدمت میں معذرت پیش کرتے ہیں اور اپنی تقصیر کا اعتراف کرتے ہیں۔ بعض فاش اغلاطِ کتابت کی تصحیح میں تقصیر کی وجہ سے بھی جاتی ہیں۔

مزید براں مہینہ میں چار جمعے ہوتے ہیں اور ہر جمعہ کے خطاب کے متعلق جی یہ چاہتا ہے کہ اسے ’میثاق‘ میں شائع کیا جائے لیکن یہ ممکن نہیں لہٰذا ہمارے اپنے

خیال کے مطابق جو خطاب اہم تر ہوتا ہے اُسے ہی منتقل کر کے 'میثاق' میں شائع کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ۔ اس کے باوجود بعض وجوہ سے خطاب بر وقت شائع بھی نہیں ہو پاتے ۔ چنانچہ امیرِ محترم کے خطاب "کیا پاکستان میں ایرانی طرز کا انقلاب ممکن ہے ؟" کی باری اب جنوری ۸۵ء میں آئی ہے جبکہ یہ خطاب اواخر اگست ۸۴ء کو ارشاد کیا گیا تھا ۔ اسی خطاب کا تتمہ وہ خطاب ہے جو اواخر ستمبر ۸۴ء میں "کیا ایرانی انقلاب اسلامی انقلاب ہے ؟" کے موضوع پر کیا گیا تھا ۔ ہماری کوشش ہے کہ یہ خطاب اگلے ماہ کے شمارے میں شائع ہو جائے تاکہ اس موضوع پر امیرِ محترم کا نقطۂ نظر واضح طور پر قارئین کرام کے سامنے آ جائے ۔

بید اللہ التوفیق وعلیہ التکلان

اعتذار " اس ماہ "الہدیٰ" کے دروس کے سلسلہ میں سورہ تغابن کے درس کی دوسری نشست کی قسط شائع ہونی تھی ۔ لیکن خوشنویس صاحب سے اس کا مسودہ گم ہو گیا ۔ اب اُسے دوبارہ کیسٹ سے منتقل کرنا ہو گا لہٰذا ہمیں افسوس ہے کہ یہ قسط اس شمارہ میں شامل نہیں کی جا سکی ۔ ●●

نبی اکرم کی اصل جلالتِ قدر اور عظمتِ شان کو
کوئی نہیں جان سکتا، مختصراً یہی کہا جا سکتا ہے کہ
"بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر"
ہمارے لیے اصل قابلِ غور مسئلہ یہ ہے کہ:
کیا ہم آپ کے دامن سے صحیح طور پر وابستہ ہیں ؟
اس لیے کہ اسی پر ہماری نجات کا دار و مدار ہے
اس اہم موضوع پر
ڈاکٹر اسرار احمد کی مختصر لیکن نہایت مؤثر تالیف
نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے
ہمارے تعلق کی بنیادیں
کا خود بھی مطالعہ کیجئے اور اس کو پھیلا کر تعاون علی البر کی سعادت حاصل کیجئے
خصوصی رعایت: تبلیغی تقسیم کیلئے یک صد نسخوں پر ۲۰ فی صد کمیشن دیا جائے گا ۔

بعثتِ انبیاء و رسل کا اساسی مقصد ــــ اور
بعثتِ محمدی کی تکمیلی و تکمیلی شان ــــ نیز
انقلابِ نبوی کا اساسی منہاج ــــ
ایسے اہم موضوعات پر
ڈاکٹر اسرار احمد
کی
حد درجہ جامع تصنیف
نبی اکرم کا مقصدِ بعثت
کا مطالعہ کیجیے
اعلیٰ سفید کاغذ ○ عمدہ طباعت ○ قیمت فی نسخہ ۳ روپے
مرکزی انجمن خدام القرآن ○ ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن ○ لاہور

اسرار احمد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ و تبصرہ

'میثاق'، بابت ستمبر ۸۴ء میں "قرآن حکیم کے نام پر اٹھنے والی تحریکوں کے بارے میں علماءِ کرام کے خدشات"، کے موضوع پر راقم الحروف کے خطاب کی اشاعت کے بعد تبصروں، تنقیدوں اور مشوروں کا جو سلسلہ ذاتی خطوط اور دینی جرائد میں شائع شدہ مضامین کی صورت میں شروع ہوا تھا، وہ تاحال جاری ہے۔

گذشتہ شمارے میں ہم نے بعض خطوط میں جو اہم نکات اٹھائے گئے تھے اُنکے ضمن میں بھی اپنی گذارشات پیش کر دی تھیں — اور خصوصاً معاصر 'الخیر' ملتان میں شائع شدہ دو اہم تحریروں کے مشترک نکات کے ضمن میں بھی مفصل وضاحت پیش کر دی تھی — خاص طور پر 'تقلیدِ جامد' اور 'اجتہادِ مطلق' کے بین بین "نیم تقلید" کی جو اصطلاح راقم نے وضع کی تھی اُس کے ضمن میں کچھ راقم کے عجزِ بیان، کچھ اختصار اور کچھ بعض دوسرے اسباب سے جو مغالطے پیدا ہو گئے تھے اُن کے ازالے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔

حُسنِ اتفاق سے مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہ، گذشتہ ماہ بنفسِ نفیس پاکستان تشریف لے آئے اور انہوں نے 'میثاق' میں نہ صرف اپنا مکتوب اور اس پر راقم کا شکریہ ملاحظہ فرمالیا بلکہ متذکرہ بالا موضوع پر 'الخیر' کے مضامین بھی پڑھ لئے اور راقم کی وضاحت بھی ملاحظہ فرمالی — اس پر اُن کا یہ 'قول فیصل' راقم کے لئے بہت ہی حوصلہ افزائی کا موجب ہوا ہے، اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے:

"... ڈاکٹر صاحب نے اس نزاعی خطاب میں تفصیلی طور پر نہ سہی، اجمالی طور پر جس آرزو کا اظہار کیا ہے اُس سے بعض علماءِ کرام کو شکایت پیدا ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے 'میثاق' نومبر کے پرچے میں اس غلط فہمی کو

دُور کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے وہ علماءِ حق کو مطمئن کرنے کے لئے کافی ہے ۔ مجھے امید ہے کہ تقلید اور نیم تقلید جیسے جزوی مسائل کو دعوتِ قرآنی کے بنیادی مشن کے مقابلے میں اہمیت نہیں دی جائے گی ۔

پاکستان کے اندر اس وقت جزوی مسائل میں مختلف مکاتبِ فکر کے علماء جس طرح آپس میں گتھم گتھا ہیں اور مخالفِ شریعت عناصر اس کو ہوا دے کر علماءِ دین کا مذاق اڑوا رہے ہیں اور اس حربِ عقائد سے وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ملک میں شرعی نظام قائم کرنے کا مطلب اس لڑاکو طبقے کے ہاتھ میں ملک کی باگ ڈور دینا ہے ــــ اس کا تقاضا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے فقہی موقف کی حوصلہ افزائی کی جائے ــــ موصوف کا مقصد یہی ہے کہ جزوی اور فروعی اختلافات کی شدت اور ہنگامہ آرائی کم سے کم ہو جائے اور ملت کی پوری طاقت و توجہ دینِ برحق کی اصول دعوت پر مرکوز ہو جائے ۔ ۔ ۔ ۔"

حضرت مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہٗ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے والدِ ماجد کے نام نامی سے معنون مدرسے کے مہتمم اور صدر مدرس ہیں جو نئی دہلی میں واقع مشہور قبرستان "مہندیاں" میں واقع ہے جہاں نہ صرف شاہ ولی اللہؒ اور ان کے تمام جلیل القدر فرزند بلکہ اس عظیم خانوادے کی اور بھی متعدد عظیم ہستیاں محوِ استراحت ہیں[1]، راقم کے نزدیک اسی تعلق اور نسبت کا پرتو کامل ہے جو مولانا قاسمی مدظلہٗ کی مندرجہ بالا سطروں میں جھلک رہا ہے آخر کیسے ممکن تھا کہ "الانصاف فی بیانِ سببِ الاختلاف" ایسی عظیم کتاب کے عظیم مصنف کے ساتھ اس قدر قریبی تعلق بھی اپنے اثرات نہ پیدا کرتا !

---

[1] الحمدللہ کہ اپریل ۸۴ء میں راقم الحروف کو دہلی میں نہ صرف یہ کہ مدرسہ حسین بخش کی اس تاریخی جامع مسجد میں خطابِ جمعہ کا موقع ملا جہاں کبھی سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلویؒ وعظ فرمایا کرتے تھے اور اب مولانا قاسمی مدظلہٗ خطابت کے فرائض سرانجام دیتے ہیں بلکہ مدرسہ رحیمیہ کی زیارت اور اس کے ساتھ خانوادۂ ولی اللہیؒ کے قبرستان میں حاضری کی سعادت بھی حاصل ہوئی !

بہر حال ہمیں قوی امید ہے کہ نہ صرف معاصر 'الخیر' کے مدیر گرامی مولانا محمد انہر اور موقر مضمون نگار مولانا عبدالقیوم حقانی بلکہ وہ تمام علماء کرام جن کی نگاہوں سے ہماری یہ گذارشات گذری ہوں گی ہماری وضاحتوں سے پوری طرح مطمئن ہو گئے ہونگے !

گذشتہ ماہ کی گذارشات کے اختتام پر عرض کیا گیا تھا کہ "البتہ ایک بات ایسی ہے کہ جس پر آئندہ کسی صحبت میں تفصیلی گفتگو ہوگی۔ اور وہ ہے "مولانا مودودی مرحوم اور تحریک جماعتِ اسلامی کے بارے میں میری رائے اور اُن کے ساتھ میرے تعلق کی نوعیت"۔۔۔ اس سلسلے میں ارادہ تو یہی تھا کہ اسی شمارے میں یہ فرض ادا ہو جائے لیکن ایک طرف تو یکم دسمبر ۸۴ء سے لاہور میں تنظیم اسلامی کے زیر اہتمام ایک چالیس روزہ تربیتی پروگرام جاری ہے جس میں راقم کی بھی شدید مصروفیت رہی، دوسری طرف یہ موضوع ایسا ہے کہ جس کے ضمن میں اختصار غلط فہمیوں کا باعث بن سکتا ہے، اور ضرورت ہے کہ بات مفصل اور پوری طرح کھل کر کی جائے تاکہ اس مسئلے میں راقم کے طرز فکر میں اگر کوئی غلطی ہو تو وہ بھی پوری وضاحت کے ساتھ ان علماء کرام کے سامنے آجائے جنہیں راقم کے کام سے فی الجملہ دلچسپی اور ہمدردی ہے تاکہ وہ اس غلطی کے ازالے میں میری مدد کر سکیں ——— یہی وجہ ہے کہ اس معاملے میں میں از خود بھی تفصیل کے ساتھ لکھنے کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ چنانچہ ۸۲ء میں میں نے "مولانا مودودی مرحوم اور میں" کے عنوان سے ایک سلسلۂ مضامین شروع کیا تھا لیکن افسوس کہ اُن ہی اسباب کی بنا جن کی تفصیل گذشتہ شمارے میں عرض کی جا چکی ہے وہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ بہر حال اب ان شاء اللہ راقم اپنی پہلی فرصت میں نہ صرف اُس کی تکمیل کی کوشش کرے گا، بلکہ مولانا مرحوم کے 'فکر' اور زندگی کے مختلف ادوار میں اُن کے اختیار کردہ 'طریق کار' کے بارے میں اپنی رائے تفصیلاً پیش کرے گا۔ اللہ سے دُعا ہے کہ وہ راقم کو اس ارادے کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائے!

نومبر ۸۴ء کے 'میثاق' میں "مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم، جمعیۃ علماء ہند اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ" کے عنوان سے میری ایک تحریر پر کہروڑ پکا ضلع ملتان

سے ایک عالمِ دین مولانا اللہ بخش ایاز ملکانوی کے دو خطوط اور اُن کا وہ ملخص جو معارف الخیر، ملتان میں شائع ہوا تھا، راقم کے تفصیلی جواب کے ساتھ ہدیۂ ناظرین کیا گیا تھا۔ اس پر ایک تو تفصیلی گرفت حضرت مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہٗ نے فرمائی ہے جو اس پرچے میں شائع کی جا رہی ہے۔ اُس کے ضمن میں ہماری گذارشات ان شاء اللہ آئندہ شمارے میں پیش کی جائیں گی۔

البتہ اُسی سلسلہ میں کچھ اختصار اور کچھ روا روی میں نکلے ہوئے چند الفاظ سے ایک وسیع حلقے میں جو بدگمانی پیدا ہوئی ہے اُس کا ازالہ فوری طور پر ضروری ہے۔ وہ بدگمانی راقم کے ان الفاظ سے پیدا ہوئی ہے:۔

(۲) "پھر کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ طبقۂ علماء کی وہ آخری شخصیت تھے جنہوں نے جو کام بھی کیا، اپنے بل بوتے پر کیا — جس کا اصل نقشۂ کار بھی ان ہی کے ذہن کی پیداوار تھا — اور اس پر عملی جد وجہد کی قیادت و رہنمائی بھی خود ان ہی کے ہاتھ میں تھی — ان کے بعد سے برصغیر میں قومی اور عوامی سطح پر علماءِ کرام کی مختلف تنظیموں کی حیثیت عظیم تر اور سیکولر مزاج سیاسی تحریکوں کے ضمیموں کی رہی ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ جیسی عظیم شخصیت کی قیادت کے باوصف جمعیت العلماء ہند کی حیثیت کانگرس کے ضمیمے سے زیادہ نہ تھی — اسی طرح مولانا شبیر احمد عثمانیؒ ایسی نابغہ شخصیت کی قیادت کے باوصف جمعیت علماءِ اسلام کی حیثیت مسلم لیگ کے ضمیمے سے زیادہ نہ تھی — اور یہی صورتِ حال آج تک جاری ہے کہ اس وقت بھی حلقۂ دیوبند کے سیاسی اور عوامی مزاج کے حامل علماءِ کرام اپنی تمام تر جلالتِ شان اور مرتبہ و مقام کے باوصف یا موجودہ فوجی آمریت کا ضمیمہ ہیں یا ایم آر ڈی کا — اور یا پھر جماعتِ اسلامی کے مانند "نہ ضمیمے دروں، نہ ضمیمے بروں"، بلکہ صحیح تر الفاظ میں "نہ اِدھر نہ اُدھر" کا مصداق بن کر رہ گئے ہیں (اور کم و بیش یہی حال بریلوی مکتبۂ فکر اور اہل حدیث حضرات کی قیادت کا ہے۔"

ان الفاظ پر مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے عقیدت مند اور اُن کے سیاسی موقف کے

حامی حضرات کی جانب سے تو کوئی ردِّ عمل راقم کے علم میں نہیں آیا البتہ مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ کے حلقۂ ارادت وعقیدت سے وابستہ اور اُن کی سیاسی حکمتِ عملی سے اتّفاق رکھنے والے حضرات کی جانب سے شدید ردّ عمل ظاہر ہوا ہے چنانچہ اس ضمن میں متعدد حضرات نے مولانا سیّد حامد میاں مدظلہٗ کے نام شکایتی خطوط تحریر فرمائے ہیں کہ "آپ ڈاکٹر اسرار احمد کے سرپرست اور اُس کی قائم کردہ 'تنظیم اسلامی' کے مستشارین میں سے ہیں اور اس نے مولانا حسین احمد مدنیؒ اور جمعیۃ علماء ہند کو "کانگرس کا ضمیمہ" قرار دیا ہے ـــــ جبکہ آپ نے صرف یہ کہ ذہناً اور قلباً "مدنی" ہیں بلکہ مولانا حسین احمد مدنیؒ کے خلیفۂ مجاز بھی ہیں!"[1] ـــــ چنانچہ مولانا نے کمالِ شفقت کے ساتھ بعض خطوط بھی راقم کے حوالے کر دیئے اور یہ ہدایت بھی فرما دی کہ اس ضمن میں مناسب وضاحت راقم الحروف خود ہی کر دے!

اس سلسلے میں گذارش ہے کہ :

۱ ـ راقم کے نزدیک مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ اور مولانا بشیر احمد عثمانیؒ دونوں ہی (بقول مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہٗ) "حضرت شیخ الہندؒ کی جماعت" سے تعلق رکھتے ہیں ـ اور دونوں کا خلوص واخلاص، تقویٰ وتدیّن اور للّٰہیت، وفی اللّٰہیت، ہر شک وشبہ سے بالا، اور دونوں کا علم وفضل کے اعتبار سے مقام ومرتبہ ہر معیار اور پیمانے سے نہایت اعلیٰ وارفع ہے ـ

۲ ـ جہاں تک سیاسی حکمتِ عملی کا تعلّق ہے اُس کے اعتبار سے راقم کو مولانا بشیر احمد عثمانیؒ کے موقف سے اتّفاق اور حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ کے موقف سے اختلاف ہے ـ راقم کے نزدیک مولانا مدنیؒ نے اپنی خود نوشت سوانح "نقشِ حیات" میں اپنے سیاسی موقف کے بارے میں جو یہ فرمایا ہے کہ یہ تحریکِ شہیدینؒ کا تسلسل ہے تو یہ بات صد فی صد درست ہے، لیکن ایک پوری صدی گذر جانے کے باعث حالات میں مختلف اعتبارات سے جو تبدیلی آگئی تھی اُس کے پیشِ نظر اس میں تبدیلی کی ضرورت تھی، جس کے لیے حضرت شیخ الہندؒ کے خطبۂ صدارت، اجلاس جمعیۃ علماء ہند، نومبر ۱۹۲۰ء میں موجود

---

[1] یہ ترجمانی ہے، اقتباس نہیں، گویا روایت 'بالمعنیٰ' ہے 'باللّفظ' نہیں!

ہیں ــــ اور راقم کی رائے یہ ہے کہ اگر حضرت شیخ الہندؒ کو اللہ مزید زندگی عطا فرماتا تو اُن کی سیاسی حکمتِ عملی میں وہ تبدیلی لازماً آتی اور اس صورت میں برّصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی ملّی نشأۃ ثانیہ کے 'قائدِ اعظم' لازماً وہی ہوتے ـــــ لیکن 'ماشاءَ اللّٰہ کانَ و مالم یشاء لم یکن!'

۳ - بایں ہمہ مولانا مدنیؒ کے خلوص و اخلاص، اور علم و فضل بلکہ 'مجاہدانہ کردار' کی عظمت کا جو نقش راقم کے دل پر قائم ہے سیاسی حکمتِ عملی کے ضمن میں اس اختلافِ رائے کا اُس پر ہرگز کوئی اثر نہیں ہے۔ اور اگرچہ سیاسی موقف کے ضمن میں اتفاقاً اور خصوصاً حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمۂ قرآن پر جو حواشی مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے تحریر فرمائے اُن سے پورے ثلث صدی کے مسلسل استفادے کی بنا پر اُن کی ذات سے ایک خصوصی 'احسانمندی' کا تعلق راقم کو اضافی طور پر حاصل ہے ــ تاہم جہاں تک میرے دل کا تعلق ہے اُس پر مولانا مدنیؒ کے 'عظمتِ کردار' کا نقش مقابلتہً بہت زیادہ گہرا ہے۔ گویا اگر میں یہ کہوں کہ میں ذہناً 'عثمانی' لیکن قلباً 'مدنی' ہوں تو یہ کیفیتِ واقعی کی غلط تعبیر نہ ہوگی۔ (اس ضمن میں مَیں اس وقت کچھ زیادہ عرض نہیں کرنا چاہتا اس لئے کہ ہوسکتا ہے کہ بعض ناقدین اِسے 'دقتی سخن سازی' سے تعبیر فرمائیں۔ ان شاء اللہ جلد ہی مَیں 'میثاق' میں شائع شدہ اپنی بیس سال کی تحریروں کے متعلقہ اقتباسات پیش کر دوں گا)

۴ - راقم نے ان دونوں بزرگوں اور انکی 'جمعیتوں' کے ضمن میں "ضمیمہ" کا لفظ ان کی شخصیتوں، یا اُن کی نیتوں، یا اُن کے اپنے نقشہ ہائے کار کے اعتبار سے نہیں بلکہ برّصغیر کی سیاسی صورتِ حال کے واقعی اور معروضی مطالعے اور 'نتائجِ کار' کے اعتبار سے استعمال کیا ہے ـــــ یعنی اس واقعہ کے اظہار اور اس حقیقت کی تعبیر کے لئے کہ سیاسی میدان میں برّصغیر کے مسلمانوں پر علماء کرام کی گرفت کمزور ہوتی چلی گئی ــ اور بالخصوص جہادِ حریت اور تحریکِ استخلاصِ وطن کے میدان میں حضرت شیخ الہندؒ کے براہِ راست جانشین یعنی حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور اُن کی زیرِ قیادت 'جمعیۃ علماء ہند' کا اثر و رسوخ دن بدن کمزور سے کمزور تر ہوتا چلا گیا تا آنکہ واقعات و نتائج کے اعتبار سے اُن کی حیثیت کانگریس کے "ضمیمے" سے زیادہ نہ رہی ـــــ (نیز

رہے کہ اس پہلو سے اگرچہ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی حکمتِ عملی بالفعل کامیاب رہی، لیکن چونکہ مسلم لیگ کی قیادت میں اُن کا مقام بھی ثانوی و ضمنی تھا لہٰذا راقم نے خود انہیں اور ان کی 'جمعیۃ علماءِ اسلام' کو بھی مسلم لیگ کا "ضمیمہ" ہی قرار دیا ہے ——

بہرحال یہ معاملہ 'واقعات' اور 'نتائج' کے اعتبار سے ہے نہ کہ انکی 'ذوات' اور 'نیات' کے اعتبار سے!

اُمید ہے کہ ہماری اس وضاحت سے وہ بدگمانی رفع ہو جائے گی جو اُس جملے میں پیدا ہو گئی ہے جس سے راقم کو نہایت گہرا قلبی تعلق ہے۔ واللہ علیٰ ما اقول شہید![1]

حال ہی میں ماہنامہ 'بینات' کراچی کے ادارتی صفحات میں ایک مفصل تبصرہ تحریر فرمانا شروع کیا ہے مدیرِ گرامی مولانا محمد یوسف لدھیانوی صاحب نے، اس کی تاحال پہلی قسط شائع ہوئی ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ مضمون طویل ہو گا —— لہٰذا اس کے ضمن میں بہتر یہی ہے کہ مضمون پورا شائع ہو جائے تب ہی اپنی گذارشات پیش کی جائیں۔

سردست مولانا موصوف کی خدمت میں صرف اس قدر عرض ہے کہ وہ یہ ہرگز خیال نہ فرمائیں کہ ان کے بعض 'تیکھے' جملوں کے باوصف ہمیں اُن سے اس تبصرے

---

[1] اس ضمن میں تفاصیل تو ان شاء اللہ بعد میں آ ہی جائیں گی۔ ایک واقعہ کا اظہار موقع کی مناسبت سے مفید رہے گا اور وہ یہ کہ پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم و مغفور نے جو ایک طویل تحریر "مولانا مدنیؒ کی شان میں بے ادبی اور گستاخیوں پر توبہ نامہ" کے طور پر تحریر کی تھی وہ سال بھر سے زیادہ عرصہ تک 'خدام الدین' کے دفتر میں پڑی رہی اور اسے شائع کرنے کی ادارہ خدام الدین کو ہمت نہ ہوئی یا اس وقت کے حالات کے پیشِ نظر اسے مناسب نہ سمجھا گیا —— لیکن اسے شائع کیا پوری آب و تاب کے ساتھ راقم الحروف نے 'میثاق' میں جہاں سے بعد میں نقل کیا 'انوارِ مدینہ' نے!

پر کوئی ملال ہوا ہے یا ہوگا، ہمیں یقین ہے کہ وہ یہ کام لِلّٰہ و فی اللہ اور خالصتہً ہماری خیر خواہی کے جذبے سے کر رہے ہیں اور ان شاء اللہ جیسے انہوں نے راقم کی زبان کی ایک غلطی پکڑی ہے (جس پر راقم ان کا ممنون ہے) اُس طرح راقم کی سوچ میں بھی جس کجی کی نشان دہی وہ کریں گے اُس سے ہم حتی المقدور استفادہ کریں گے۔ اور کوئی جوابی وضاحت پیش کریں گے تو وہ بھی بغرضِ اصلاح ہی ہوگی ——!!

اطلاع متعلقہ

حلقۂ مستشارین تنظیم اسلامی

(۱) الحمد للہ کہ مولانا اخلاق حسین قاسمی مہتمم و شیخ التفسیر جامعہ رحیمیہ، مرکز حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ، خواجہ میر درد روڈ، نئی دہلی (بھارت)، نے تنظیمِ اسلامی کے حلقۂ مستشارین میں باضابطہ شمولیت قبول فرمالی ہے!

(۲) مولانا سید وصی مظہر ندوی، مہتمم جامعہ اسلامیہ، ٹھنڈی سڑک، حیدر آباد (سندھ) کو اُن کے اپنی تنظیم کے ساتھ وابستگی اختیار کر لینے کی بنا پر جس کے رُوحِ رواں اور ناظم و رجم، کو اسلامی حد تسلیم نہیں کرتے بعد رنج و افسوس تنظیمِ اسلامی کے حلقہ مستشارین کی رکنیت کی ذمہ داری سے سُبکدوش کر دیا گیا ہے۔

المعلن: (چودھری) غلام محمد، قیم تنظیمِ اسلامی، پاکستان

کیا پاکستان میں ایرانی طرز کا انقلاب ممکن ہے؟

محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ نے ۳۱/۸/۸۲ء کے جمعہ کو مسجد دارالسلام لاہور میں مندرجہ بالا موضوع پر جو خطاب ارشاد کیا تھا وہ کیسٹ سے منتقل کر کے قدرے حک و اضافہ کے ساتھ پیش خدمت ہے۔
(جمیل الرحمٰن)

الحمد للہ - الحمد للہ وکفیٰ والصلوٰۃ والسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ خصوصًا علیٰ افضلھم وخاتم النبیین محمدن الامین وعلیٰ آلہ وصحبہ اجمعین - امابعد
فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
یٰٓاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝
وقال تبارك وتعالیٰ فی سورۃ الشوریٰ :
شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰی بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ وَمَا وَصَّیْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰی وَعِیْسٰٓی اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ ط -
وقال اللہ عزوجل فی سورۃ الصف :
هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ۝
وقال سبحانہ وتعالیٰ فی سورۃ الانفال :
وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّیَكُوْنَ الدِّیْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ط - امابعد :
فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم -

اَلْمُجَاهِدُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ مَنْ یُّقْتِلُ لِتَکُوْنَ کَلِمَۃُ
اللّٰہِ هِیَ الْعُلْیَا - (اَوْکما قال صلی اللہ علیہ وسلم)
رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَیَسِّرْ لِیْٓ اَمْرِیْ وَاحْلُلْ عُقْدَةً
مِّنْ لِّسَانِیْ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ -
اللّٰھم ربنا الھمنا رشد نا واعذنا من شرور انفسنا۔
اللّٰھم ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلا
وارزقنا اجتنابہ -
اللّٰھم وفقنا ان نقول بالحق اینما کنا لانخاف فی
اللہ لومۃ لائم -

آمین یا ربّ العٰلمین ٥

حضرات! گزشتہ جمعہ میں مَیں نے عرض کر دیا تھا کہ انشاء اللہ میں آئندہ جمعہ کو اس موضوع پر اظہارِ خیال کروں گا کہ "کیا پاکستان میں ایرانی طرز کا انقلاب ممکن ہے؟" لہٰذا مجھے آج اسی موضوع پر کچھ عرض کرنا ہے - آپ شروع ہی سے محسوس کر رہے ہوں گے کہ میرا گلا خراب ہے - گزشتہ جمعہ سے لے کر آج تک شدید مصروفیت رہی - اس دوران پانچ دن میرے ایبٹ آباد، مانسہرہ، مظفر آباد اور راول کوٹ کے دعوتی دورے میں گزرے ہیں - کل رات ہی اس دورے سے واپسی ہوئی ہے - مَیں آج صبح گن رہا تھا تو گزشتہ جمعہ کے بعد سے اب تک میں نے گیارہ تقریریں کی ہیں - جن میں سے کوئی بھی شاید ڈیڑھ گھنٹے سے کم کی ہو - بہرحال دعا کیجئے کہ گلا ساتھ دے اور مَیں آج جس موضوع پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں اس پر میں اپنے خیالات اور اپنے مافی الضمیر کو اطمینان اور انشراحِ صدر کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کر سکوں - اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا تو عیدالاضحیٰ کے بعد آنے والے جمعہ میں ——— آج کی تقریر کی دوسری کڑی پر اظہارِ خیال کرونگا جس کا موضوع ہو گا کہ : "کیا ایران کا انقلاب اسلامی انقلاب ہے؟"

پس منظر

آج کے موضوع کا ایک پس منظر ہے ویسے تو بہت عرصے سے میرے بارے میں اخبارات میں جو چہ میگوئیاں جاری تھیں، ان میں یہ بات بھی شامل تھی کہ یہ شخص پاکستان میں ایرانی طرز کا انقلاب لانا چاہتا ہے - جس زمانے

میں پردے وغیرہ کے معاملہ میں بحث چل رہی تھی تو بعض انگریزی اخبارات نے مجھے پاکستانی خمینی کا خطاب بھی دیا تھا۔ لیکن اصل میں اس وقت یہ موضوع میرے سامنے آیا ہے تو اس کی دو وجوہ ہیں، ایک یہ کہ میں اس مرتبہ جب شمالی امریکہ کے دعوتی دورے کے بعد پاکستان واپس آرہا تھا تو چار دن کے لئے میں نے انگلستان میں بھی قیام کیا۔ لندن میں ایک مسلم انسٹی ٹیوٹ قائم ہے، جس کے سربراہ ایک ہندوستانی مسلمان ہیں، اصلاً لکھنوی تھے اس کے بعد وہ پاکستانی ہوئے اور اب وہ انگلستانی ہیں۔ ان کا اسم گرامی ڈاکٹر کلیم صدیقی ہے۔ وہ ایرانی انقلاب کے اس درجہ حامی و مؤید اور اس کے اتنے قائل اور ہر اعتبار سے اتنے معترف ہیں کہ انہوں نے اس موضوع پر بہت سے مقالات اور مضامین شائع کئے اور متعدد سیمینار منعقد کئے ہیں۔ جن دنوں میں لندن میں تھا ان کے ادارے کے زیر اہتمام ایک سیمینار کا سلسلہ چل رہا تھا۔ چند دنوں بعد ایک سیمینار ہونے والا تھا جس کا موضوع تھا "پاکستان کا مستقبل"۔ یعنی کچھ لوگ پاکستان سے ہزاروں میل دور انگلستان میں بیٹھ کر پاکستان کے مستقبل کے بارے میں قیاس آرائیاں کرنا چاہتے ہیں۔ یہ نہیں کہ یہاں آئیں، منجدھار میں کودیں اور حالات کو بہتر بنانے کی کوشش کریں۔ لیکن انگلستان کی ٹھنڈی فضاؤں میں بیٹھ کر نظریات بگھارنا، ظاہر بات ہے کہ اس میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔ اس اجلاس میں کیا کچھ کہا گیا ہے اس کا تو مجھے علم نہیں ہے چونکہ میری پاکستان کے لئے روانگی طے تھی۔ لیکن اس سے پہلے جب میں وہاں تھا تو وہاں جو سیمینار ہو رہا تھا وہ ایرانی انقلاب کے بارے میں تھا۔ اس میں شرکت کی دعوت عام نہیں تھی بلکہ دعوتی کارڈ جاری کئے گئے تھے۔ میں بھی بطور سامع اور مبصر شرکت کے لئے وہاں چلا گیا۔ منتظمین نے ایک تو میرے ساتھ زیادتی یہ کی کہ جیسے ہی میں وہاں لابی میں جا کر کھڑا ہوا۔ ابھی ہال میں داخل بھی نہیں ہوا تھا کہ تین مندوبین جو شکل و صورت سے عالم دین معلوم ہوتے تھے، ان میں سے ایک صاحب کے متعلق مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ ان کا سابقہ تعلق جماعت اسلامی کے ساتھ تھا۔ اور یہ تینوں حضرات سندھی تھے۔ یہ حضرات میرے قریب آگئے جیسے ملاقات ہوتی ہے، پذیرائی ہوتی ہے اور آس پاس کھڑے ہو گئے اور فوراً ہی فوٹو لے لیا گیا اور دوسری زیادتی یہ کی کہ اگلے دن وہ فوٹو روزنامہ جنگ لندن کے پہلے صفحے پر بڑے نمایاں انداز میں شائع کر دیا گیا جس میں گویا کہ مجھے بھی اس سیمینار کے [illegible]

میں وہاں نہ کسی مندوب کی حیثیت سے گیا تھا نہ وہاں میری شرکت ان معنوں میں تھی میں تو وہاں ایک عام شریک ایک عام سامع اور ایک عام SPECTATOR کی حیثیت سے گیا تھا۔ وہاں شرکا میں کچھ پاکستانی حضرات بھی تھے۔ روزنامہ مسلم (انگریزی) راولپنڈی کے مدیر تھے، ایک صاحب کوئٹہ سے تھے، تین حضرات سندھ سے تھے، اس سے زیادہ میں واقف نہیں ہوں ـــ بہرحال وہاں جو بات بڑے شدومد کے ساتھ کہی گئی اور جن خیالات کا بڑے زور شور سے اظہار کیا گیا۔ وہ یہ تھے کہ کامل ترین اسلامی انقلاب، اعلیٰ ترین اسلامی انقلاب اور IDEAL ترین اسلامی انقلاب ـــ ایرانی انقلاب ہے اور اسی کے نقشِ قدم کی پیروی ہونی چاہیئے اور تمام مسلم ممالک کے لوگوں کو اسی نہج سے اپنے اپنے ممالک میں انقلاب برپا کرنے کے لئے کمربستہ ہوجانا چاہیئے۔ یہ تمام تقاریر کا لُبِّ لباب تھا۔ مجھے بعد میں خیال آیا کہ وہاں مجھے جس طریقے سے اخبار میں پیش کیا گیا ہے تو اس سے لوگ اس مغالطے میں مبتلا ہوسکتے ہیں کہ گویا مجھے بھی سیمینار میں پیش کردہ خیالات سے اتفاق ہے اور میں ان کا حامی ہوں لہذا میرے لئے ضروری ہے کہ اس موضوع پر مجھے اب اپنا موقف واضح طور پر بیان کردینا چاہیئے۔ چنانچہ وہاں ایک بڑے اجتماع میں، میں نے خاص طور پر اسلامی انقلاب کے خصائص پر مفصل اظہارِ خیال کیا۔

پیش منظر

پاکستان واپسی پر معلوم ہوا کہ یہاں لاہور میں بھی ہوٹل فلیٹیز میں ایک بڑی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں ایرانی انقلاب کی تائید و توثیق کی گئی اور بین السطور تقاریر میں پاکستانی مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا گیا اور فی الجملہ ان کی یہ رہنمائی کی گئی کہ ان کو بھی پاکستان میں ایرانی طرز کے انقلاب کے لئے جدوجہد اور کوشش کرنی چاہیئے۔ اگرچہ یہ بات تاحال میرے لئے حیران کن ہے کہ یہ پتہ نہیں چل سکا کہ لاہور کے ایک معیاری ہوٹل میں اس عظیم الشان کانفرنس کا انعقاد کس کی جانب سے کیا گیا تھا! اس پر تو کافی صرفہ ہوا ہوگا۔ معلوم ہوا کہ اخبارات میں اس پر چہ میگوئیاں بھی ہوئیں بعض لوگوں نے شاید اس کا کنوینر کالعدم جماعت اسلامی کو ٹھہرایا۔ لیکن سید اسعد گیلانی کی طرف سے اعلانِ برأت آگیا کہ اس کانفرنس کے انعقاد سے جماعت کا کوئی تعلق نہیں۔ البتہ میری معلومات کے مطابق گیلانی صاحب اس

میں شریک تھے۔ ——— بہر حال یہ معاملہ ایک سوالیہ نشان ہے کہ اس طرح کی بڑی بڑی کانفرنسیں ہمارے ملک کے اعلیٰ ہوٹلوں میں منعقد ہوں تو عوام الناس کو معلوم تو ہونا چاہیئے کہ ان کا داعی کون ہے! کس کی طرف اُن ذمہ داریوں کو اصلاً لوٹنا چاہیئے جو ایسے سیمینار اور ایسے اجتماعات میں کہی جاتی ہیں۔ بہر حال اُس کانفرنس میں جو تقاریر ہوئیں میری معلومات کی حد تک ان کا لب و لباب اور خلاصہ یہی ہے کہ پاکستان میں بھی اسلامی انقلاب کے لیئے پاکستانیوں کو ایرانی انقلاب کے طرز اور منہج عمل کو اختیار کرنا چاہیئے۔

بعض حضرات کا طرزِ فکر

یقیناً ہمارے یہاں بھی کافی تعداد میں لوگ ایسے ہیں جو مختلف اسلامی تحریکوں سے وابستہ تھے یا ہیں لیکن اپنے یہاں کی ناکامیوں سے دل برداشتہ ہو کر اور ایرانی بھائیوں کی کامیابی سے متأثر ہو کر وہ حضرات اب شاید اس طرز پر سوچ رہے ہیں کہ ہمیں بھی پاکستان میں ایرانی بھائیوں کے نقشِ قدم ہی کی پیروی کرنی ہوگی۔ جہاں تک میری ذاتی رائے کا تعلق ہے میں اسے اصلاً ایک فراری ذہنیت سمجھتا ہوں۔ یہ ایک ESCAPIST TENDENCY ہے۔ نہ اپنے حالات کو دیکھنا، نہ اُس فرق پر نگاہ رکھنا جو ہمارے اور ایران کے حالات میں ہے۔ اُسے آئیڈیل قرار دینا ان حضرات کے مقام سے مطابقت نہیں رکھتا جو اپنا ایک طریق کار رکھتے ہیں۔ یہ اغلباً اس لیئے ہے کہ چونکہ ہم کچھ کر نہیں پائے لہٰذا جنہوں نے کچھ کر دکھایا ہے ان سے اس درجے مرعوب ہو گئے ہیں کہ یہ سوچنے لگے ہیں کہ اگر کوئی کام ہو سکتا ہے تو اُسی طرز پر ہو سکتا ہے۔ ؎

یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا   ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

میرے خیال میں بعض لوگوں کی پاکستان میں اس وقت یہی ذہنی کیفیت ہے۔ اور اسی وجہ سے اس قسم کی باتیں بڑے شدومد سے ہمارے سننے میں آرہی ہیں۔

صحیح طرزِ عمل

ہمارے لئے صحیح طرزِ عمل یہ ہوگا کہ ہم دیکھیں کہ ہمیں OBJECTIVELY گہرا جائزہ لینا ہوگا کہ ہمارے ظروف و احوال کیا ہیں! ایران کے حالات اور ہمارے حالات میں کتنا فرق ہے! آیا ہم وہی طریق کار (METHODOLOGY) جوں کا توں اپنے یہاں استعمال کر سکتے ہیں کہ نہیں کر سکتے! اس سے آگے بڑھ کر ضروری بات یہ ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ آیا

ایران کا انقلاب واقعتاً ایک آئیڈیل اسلامی انقلاب ہے!! ہمارے نزدیک تو جو آئیڈیل اسلامی انقلاب ہے، وہ صرف اور صرف جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ ہم کسی کو داد دے سکتے ہیں، ہم کسی کو شاباش دے سکتے ہیں، ہم کسی کی تحسین کر سکتے ہیں کہ انہوں نے بڑی ہمت، جرأت، اور ایثار و قربانی کا مظاہرہ کیا ہے۔ ہم بڑی حد تک کسی سے یہ INSPIRATION بھی لے سکتے ہیں۔ یہ قوتِ متحرکہ بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ کہ اگر انہوں نے یہ سب کچھ کر دکھایا تو ہم کیوں پیچھے رہیں! کیوں نہ ہم بھی ہمت کریں! بقول ع آؤ ناہم بھی سیر کریں کوہ طور کی۔ اس انداز کی بات ہو تو میرے نزدیک غلط نہیں ہے۔ لیکن ہمارے لئے کوئی انقلاب IDEAL نہیں ہے، کوئی انقلاب نمونہ نہیں ہے سوائے انقلاب محمدی کے علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام ہمارے لئے تو وہ معیارِ مطلق ہے: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ لہٰذا ہم تو ہر انقلاب کو اس پر پرکھیں گے۔ اور اُسے کسوٹی قرار دے کر ہم دیکھیں گے کہ منفی و مثبت عمل دخل کتنا ہے۔ کسی بھی انقلاب اور کسی بھی تبدیلی کو جانچنے اور ناپنے کے لئے اور اس کے PROS & CONS کا فیصلہ کرنے کے لئے ہمارے پاس جو معیار اور پیمانہ ہے وہ سیرتِ محمدی ہے علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام۔

میں ان حالات کے پیشِ نظر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ میں نے اس مسئلہ پر جو سوچ بچار کیا ہے پھر مطالعہ اور چشم دید گواہوں سے جو معلومات مجھ تک پہنچی ہیں، تو وقت کا تقاضا ہے کہ اس موضوع پر میں کھل کر بات کروں۔ اس سے قبل انفرادی طور پر اور نجی گفتگو کی محفلوں میں اس مسئلہ پر میں اپنی رائے کا اظہار کرتا رہا ہوں۔ لیکن تفصیل و وضاحت اور دلائل کے ساتھ نہیں کیا۔ اب میں چاہتا ہوں کہ اس ذمہ داری کو علیٰ رؤسِ الاشہاد ادا کر دوں تاکہ میرا نقطۂ نظر پورے طور پر سامنے آجائے۔

نئی اصطلاحات

سب سے پہلے تو میں لفظِ "انقلاب" کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ پہلی بات یہ کہ یہ قرآنی اور دینی اصطلاح نہیں ہے۔ یہ دورِ جدید کی اصطلاح ہے۔ نئی اصطلاح ہے اور نئی اصطلاحات کے استعمال میں اندیشے مضمر ہوتے ہیں چونکہ ہر نئی اصطلاح اپنے ساتھ کچھ نہ کچھ نئے

تصورات لازماً رکھتی ہے۔ اور جب ہم کسی نئی اصطلاح کا استعمال شروع کر دیتے ہیں تو وہ تصورات غیر شعوری طور پر اور غیر محسوس انداز سے از خود ہمارے اذہان و قلوب میں در آتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک لفظ آئیڈیالوجی (IDEOLOGY) ہے۔ یہ لفظ ہمارے ہاں بطور اصطلاح بکثرت استعمال ہوتا ہے جیسے 'اسلامک آئیڈیالوجی' اور آئیڈیالوجی آف پاکستان وغیرہ ـــــ یہ صحیح ہے کہ اسلام نے جو بنیادی فکر دیا ہے وہ بہت حد تک آئیڈیالوجی سے مشابہ ہے۔ لیکن یہاں اس لفظ یعنی آئیڈیالوجی کے استعمال میں ایک قباحت یہ ہے کہ یہ لفظ آئیڈیا (IDEA) سے بنا ہے اور آئیڈیا دراصل انسانی ذہن کی پیداوار ہوتا ہے۔ گویا آئیڈیالوجی وہ فلسفہ ہے جو انسانی ذہن اور اُس کے غور و فکر کے نتیجے میں وجود میں آئے ـــ لہٰذا جب ہم اسلامی معتقدات کے لئے اسلامک آئیڈیالوجی کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں تو مذکورہ بالا تصور بھی ساتھ چلا آتا ہے۔ حالانکہ فی الحقیقت اسلام کا جو بنیادی فکر ہے وہ اللہ کا عطا کردہ ہے۔

اس اعتبار سے مجھے پسند نہیں ہے کہ ہم جدید اصطلاحات کا استعمال کثرت سے کریں۔ لیکن اس تصویر کا ایک دوسرا رُخ بھی ہے۔ جدید اصطلاحات کو اگر سرے سے استعمال نہ کیا جائے تو ابلاغ کا حق ادا نہیں ہوتا، بات ذہنوں تک پہنچتی ہی نہیں اس لئے کہ ہر دور میں تعلیم یافتہ طبقہ ان اصطلاحات سے مانوس ہوتا ہے، انکے معانی و مفاہیم کو سمجھتا ہے۔ لہٰذا اس طبقے کے ذہنوں تک بات کو پہنچانے کے لئے ضروری ہے کہ ہم ان جدید اصطلاحات کے حوالے سے اپنا موقف و مدعا سمجھائیں ـــــ ورنہ پہلے تو دینی اصطلاحات کو عام (EDUCATE) کرنا ہوگا۔ لوگوں کو بتانا ہوگا کہ اقامتِ دین سے کیا مراد ہے! جہاد کا حقیقی مفہوم کیا ہے! قتال کا مفہوم و مقصود کیا ہے! دعوت و تبلیغ کے معانی کیا ہیں اور ان کی اصل غایت کیا ہے! وغیرہ۔ پھر جب معاشرے میں ان اصطلاحات کے ساتھ اتنی واقفیت پیدا ہو جائے۔ کہ لوگ انکے حوالے سے بات کو سمجھ سکیں تو پھر یقیناً ابلاغ کا حق ادا ہو جائے گا ـــــ لیکن ابتداءً ہم مجبور ہیں کہ جس دور میں جن اصطلاحات کے حوالے سے لوگ عام طور پر بات کو سمجھتے ہیں انہی اصطلاحات کے ذریعے سے بات ان تک پہنچائیں۔ البتہ ان کو مستقل طور پر اوڑھنا بچھونا نہ بنا لیں، اور انہیں مستقل اصطلاحات کا درجہ نہ دے دیا جائے۔ پھر جو لوگ بات کو

سمجھتے چلے جائیں اُنہیں اُن اصطلاحات دینی سے قریب تر لا یا جائے جو قرآن وسنت سے ماخوذ ہیں۔ اس کے سوا کوئی اور عملی شکل موجود نہیں ہے۔ ـــــ چنانچہ میں اسی ضرورت کے تحت 'اسلامی انقلاب' کی اصطلاح استعمال بھی کر رہا ہوں اور ابتداءً اس اصطلاح کے استعمال کو درست خیال کرتا ہوں۔

انقلاب کے ضمن میں دینی اصطلاحات

اسلامی انقلاب اور اُس کے ضمن میں قرآنی اصطلاحات کی تفاصیل پر تو اِن شاء اللہ میں آئندہ کسی نشست میں اظہارِ خیال کروں گا۔ تاہم اس وقت ربطِ مضمون قائم رکھنے کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ میں انقلاب کے بارے میں دینی اصطلاحات کو اجمالاً بیان کردوں۔

اس ضمن میں پہلی قرآنی اصطلاح ہے "تکبیرِ رب"۔ اس کے لئے میں نے آغاز میں سورۃ مدثر کی ابتدائی آیات کی تلاوت کی تھی۔ یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ "اے لحاف میں لپٹ کر لیٹنے والے (صلی اللہ علیہ وسلم) کھڑے ہو جاؤ۔ (کمربستہ ہو جاؤ) لوگوں کو خبردار کرو اور اپنے ربّ کی تکبیر کرو"۔ اِن آیات میں، جو بعثتِ نبویؐ کے بالکل ابتدائی زمانے میں نازل ہوئیں، یہ واضح کر دیا گیا کہ آپؐ کی جدوجہد کا نقطۂ آغاز 'انذار' ہے۔ یعنی لوگوں کو خبردار کرنا، کہ مرنے کے بعد تمہیں اپنے ربّ کے حضورؐ حاضر ہونا ہوگا۔ ایک ایک قول اور ایک ایک عمل کی جوابدہی کرنی ہوگی اور پھر جزا یا سزا سے سابقہ پیش آکر رہے گا ـــــ اور تیسری آیت کے ذریعے اس جدوجہد کے منتہائے مقصود کو بیان کر دیا گیا کہ "وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ" اپنے رب کی تکبیر کرو! یعنی وہ نظام قائم کرو جس میں اللہ کو فی الواقع 'اکبر' (سب سے بڑا) اور مقتدرِ اعلیٰ (SUPREME AUTHORITY) تسلیم کیا جائے۔ انفرادی معاملات میں بھی اُس تعالیٰ کی اطاعت کی جائے اور اجتماعی سطح پر بھی اُسی کی اطاعت پر مبنی نظام قائم ہو۔ یہ ہے 'تکبیر' کا حقیقی مفہوم ہمارا معاملہ یہ ہے کہ ہم محض 'اکبر اللہ' کی تسبیح کرکے یہ سمجھتے ہیں کہ 'تکبیر' کا حق ادا ہوگیا۔ اقبالؔ نے اس بات کو بڑے پُرشکوہ انداز میں بیان کیا ہے۔

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل ۔۔۔ یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات

وہ مسلک مردانِ خود آگاہ خدا مست　　یہ مذہب ملا و جمادات و نباتات

دوسری اصطلاح ہے 'اقامتِ دین'، یعنی دین کو قائم کرنا۔ سورۂ شوریٰ کی آیت ۱۳ میں فرمایا گیا کہ "ہم نے دین میں تمہارے لئے وہی بات معیّن کی ہے جس کی وصیت کی تھی ہم نے نوحؑ کو اور جس کی وحی کی ہم نے آپؐ کی جانب اور جس کی وصیت کی تھی ہم نے ابراہیمؑ کو اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو" اور وہ بات کیا تھی جس کی وصیت کی گئی تمام انبیاءؑ کو اور وہی اب مسلمانوں کے لئے معین کی جا رہی ہے! اُسے آگے بیان فرمایا: اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ "کہ دین کو قائم کرو اور اُس کے بارے میں متفرق نہ ہو جاؤ ــــ دین کو قائم کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ اُس پورے نظام اجتماعی کو قائم کرنا جس کا نام 'دین الحق' ہے۔ جو عدل و قسط پر مبنی ایک نظام ہے جو انتہائی متوازن نظام ہے جس میں ہر ایک کے حقوق و فرائض کا تعین کر دیا گیا ہے۔ معلوم ہوا دینِ حق کو بالفعل قائم کرنے کے لئے قرآنی اصطلاح ہے 'اقامتِ دین'۔

اس سلسلے کی تیسری اصطلاح ہے 'اظہارُ دین الحق علی الدین کُلّہٖ'۔ قرآن مجید میں تین مقامات پر یہ الفاظِ مبارکہ وارد ہوئے کہ هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ۔ "وہی ہے اللہ جس نے بھیجا اپنے رسولؐ کو الہدیٰ اور دینِ حق دے کر تاکہ غالب کرے اُسے کُل کے کُل دین پر"۔ یعنی پورے نظامِ اجتماعی پر اللہ کا دین غالب ہو جائے۔ یہ نہ ہو کہ معاشیات میں تو ہم اسلام کی پیروی نہیں کر سکتے ہاں سماجی نظام ہم اسلام کے اصولوں کے تحت بنائیں گے۔ یا یہ کہ سیاست میں تو ہم اسلام کو اختیار نہیں کر سکتے البتہ اُس کا معاشرتی نظام ہم لے لیتے ہیں وغیرہ۔ اس قسم کی کوئی تقسیم اللہ تعالےٰ کے ہاں قبول نہیں۔ بلکہ مطلوب یہ ہے کہ پورے کے پورے نظام پر اللہ کا دین غالب ہو جائے۔

چوتھی اصطلاح سورہ انفال میں آئی ہے: وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّیَكُوْنَ الدِّیْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ۔ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جدّوجہد مکّی دور سے گزر کر مدنی دور میں آچکی غزوہ

بدر ہو چکا - تلوار نیام سے باہر آچکی، اب جہاد قتال کی شکل اختیار کر چکا تب یہ آیت نازل ہوئی کہ اے مسلمانو! اب جبکہ تمہاری تلوار نیام سے باہر آگئی ہے تو اب یہ نیام میں واپس نہیں جائے گی، اب تمہاری جنگ جاری رہے گی یہاں تک کہ فتنہ بالکل فرو نہ ہو جائے اور دین کُل کا کُل صرف اللہ ہی کے لئے نہ ہو جائے۔ پورا نظام زندگی اللہ کے دین کے تابع نہ ہو جائے۔

یہ چار اصطلاحات ہیں قرآنِ مجید کی اور پانچویں اصطلاح ہے "اعلاء کلمۃ اللہ" - یہ حدیث کی اصطلاح ہے - ایک شخص نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا۔ اور یہ اس دور کی بات ہے جبکہ قتال کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا - کہ حضورؐ! کوئی شخص جنگ کرتا ہے اپنی بہادری اور شجاعت کے مظاہرے کے لئے - کوئی شخص جنگ کرتا ہے اپنے دل میں مالِ غنیمت کی طلب لے کر - کوئی شخص جنگ کرتا ہے اپنی قومی یا قبائلی عصبیت کے لئے مثلاً یہ کہ حضورؐ تو خالصۃً اللہ تعالیٰ کے کلمہ کی سربلندی کے لئے جنگ فرما رہے ہیں لیکن ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص ہو جیسے کسی خاص قبیلے سے دشمنی ہو جس کی وجہ سے وہ اس وقت حضورؐ کے ساتھ شامل ہو کر جنگ کر رہا ہے لیکن اس کی اصل نیت اس قبیلہ سے انتقام لینا ہے تو اس میں عصبیت اور اپنے ذاتی انتقام کا جذبہ شامل ہو گیا - تو حضورؐ سے پوچھا گیا کہ ان میں سے کس کو ہم سمجھیں کہ وہ مجاہد فی سبیل اللہ ہے - حضورؐ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ ان میں سے کوئی بھی مجاہد فی سبیل اللہ نہیں ہے، مجاہد فی سبیل اللہ تو صرف جنگ کرتا ہے محض اس مقصد کے لئے کہ: لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا - کہ "اللہ کی بات سب سے اونچی ہو جائے"، اس کے سوا کوئی اور مقصد نہ ہو اللہ کا حکم ہی سب سے اوپر اور اللہ کا فرمان سب سے بالاتر ہو جائے - یہ ہے وہ مقصد کہ جس کے لئے اگر کوئی جنگ کرتا ہے تب اُسے مجاھد فی سبیل اللہ شمار کیا جائے گا۔

یہ پانچ اصطلاحات (چار قرآن مجید کی اور ایک حدیث شریف کی) جو میں نے آپ حضرات کے سامنے بیان کی ہیں - ان پانچوں سے مقصود کیا ہے! انقلاب - ایک ایسا نظام قائم کرنا جس میں اللہ کی حاکمیت مطلقہ کو تسلیم کیا گیا ہو اور پورا نظامِ زندگی اللہ کے دین کے تابع ہو جائے - اس مفہوم کے ابلاغ کے لئے اگر "اسلامی

انقلاب" کی اصطلاح استعمال کی جائے تو اس تمدنی ضرورت کے پیشِ نظر جو میں پہلے بیان کر چکا ہوں، میں اس کو غلط نہیں سمجھتا بلکہ درست اور مفید سمجھتا ہوں ۔

لفظِ انقلاب کی بحث

اب لفظِ انقلاب کو لیجئے! اس کے مقابل کوئی ایک لفظ تو اُردو زبان میں موجود نہیں ہے لیکن انگریزی زبان میں دو الفاظ الگ الگ ہیں جو اس مفہوم کے لئے مستعمل ہیں۔ ایک ہے 'REVOLUTION' اور دوسرا ہے 'COUP'[1] ——— ان دونوں میں بڑا فرق ہے ۔ کہیں کسی ہنگامی و فوری اقدام کے طور پر فوج حکومت پر قبضہ کر لیتی ہے تو ہم کہتے ہیں کہ 'فوجی انقلاب' آگیا۔ مگر اس کے لئے انقلاب کا لفظ صحیح نہیں۔ وہاں کوئی انقلاب نہیں آیا، صرف ایک انتظام بدلا ہے۔ سول حکومت کے بجائے فوجی حکومت آگئی اس نے ملک کا انتظام سنبھال لیا ہے سول حکومت کے بجائے فوجی حکومت آگئی اسے انقلاب نہیں کہتے اسی لئے انگریزی میں آپ اس کے لئے REVOLUTION کا لفظ کبھی نہیں دیکھیں گے بلکہ اس کیلئے لفظ COUP استعمال ہوتا ہے ۔ جبکہ REVOLUTION کے معنی ہیں ملکی نظام میں کوئی بنیادی اور مکمل تبدیلی ۔ ——— لہٰذا ہمیں ان دونوں الفاظ کے مدلولات (CONNOTATIONS) اور اپنی اپنی جگہ ان دونوں کا جداگانہ اصل مفہوم سمجھنے کی ضرورت ہے ۔

لیکن اس بحث سے پہلے ایک بنیادی بات پیشِ نظر رہنی چاہیئے کہ دورِ جدید میں انسانی زندگی کے دو علیحدہ علیحدہ حصے کر دیئے گئے ہیں ۔ ایک انفرادی اور دوسرا اجتماعی ۔ ویسے تو یہ الفاظ بہت قدیم ہیں اور کسی نہ کسی درجے میں ان کا استعمال ہمیشہ سے ہوتا چلا آرہا ہے ۔ لیکن عہدِ حاضر میں اس نے ایک باقاعدہ فلسفے کی شکل اختیار کر لی ہے ۔ جس کی بدیہیات میں سے ہے کہ مذہب ایک خالص ذاتی اور نجی (PRIVATE) معاملہ ہے جس کا اجتماعیت کے دائرے سے کوئی تعلق نہیں ۔ یہ اس فلسفے کا بنیادی مفروضہ (AXIOM) ہے بلکہ آج کے مہذّب معاشرے میں اس موضوع پر گفتگو کرنا پسند نہیں کیا جاتا کوئی کسی سے کیوں پوچھے کہ اس کا عقیدہ کیا ہے! یہ خالص انفرادی اور نجی معاملہ ہے ۔

---

[1] اس کا تلفظ 'کو' (KOO) ہے

ایک ہے اجتماعیت کا معاملہ ——— معاشرت، معیشت، ریاست وحکومت فوجداری اور دیوانی قوانین اور تعزیرات وسزا سے متعلق مسائل۔ جدید فلسفے میں ان تمام امور کو اجتماعی زندگی سے متعلق قرار دیا جاتا ہے اور اس کے لئے جدید اصطلاح سیکولر (SECULAR) استعمال کی جاتی ہے۔ یعنی یہ انسانی زندگی کا وہ حصہ ہے جس میں کسی مذہب اور کسی عقیدے کا کوئی عمل دخل نہیں ہونا چاہیئے بلکہ کسی ملک کے رہنے والے خود یا اپنے نمائندوں کی کثرتِ رائے کے ذریعے جو قانون وضابطہ چاہیں بنائیں۔ وہ مُلکی قانون (LAW OF THE LAND) کی حیثیت سے نافذالعمل ہوجائے گا۔ یہ گویا اس دَور کا آئیڈیل ہے۔ جمہوریت کا جو بلند و بالا تصوّر ہے وہ یہی ہے۔

ایک عام غلط فہمی یہ ہے کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ سیکولرزم (SECULAR ISM) کا مطلب لامذہبیت ہے کہ یہ صحیح نہیں ہے بلکہ سیکولرزم تو مذاہب کو تسلیم کرتا ہے لیکن صرف اس حد تک کہ یہ لوگوں کی انفرادی زندگی کا دائرہ ہے۔ کوئی مسجد میں جائے، کوئی مندر میں جائے، کوئی گوردوارے میں جائے، کوئی گرجے میں جائے، کوئی سینی گاگ[1] جائے یا کوئی آتش کدے میں جائے، کسی کو کوئی اعتراض کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کوئی اپنے مُردے کو دفن کردے، کوئی جلادے، کوئی گدھوں اور چیلوں کے حوالے کردے۔ کسی کو اعتراض کا حق نہیں ہے۔ کوئی شادی کے لئے نکاح کا طریقہ اختیار کرے، کوئی پھیرے ڈلوالے، کسی کو اعتراض کی جائز نہیں ہے۔ اپنے مذہبی تہواروں کو جو جس طرح چاہے، منائے، کسی کو اعتراض کا حق نہیں ہے۔ تقسیم میراث کا جس مذہب میں جو دستور ہو اس کے مطابق متوفّی کا ترکہ تقسیم کرے اُسے کامل اختیار ہے۔ یہ سارے معاملات ذاتی، نجی اور خالص انفرادی ہیں۔ کوئی کرے یا نہ کرے، نظامِ حکومت کو اس سے قطعی کوئی غرض نہیں۔ وہ ان سے بالکل لاتعلق رہے گا۔ البتہ وہ کسی بھی الہامی دین کو اجتماعیات کے دائرے میں مداخلت کی نہ اجازت دیتا ہے اور نہ اسے گوارا کرتا ہے۔ لہٰذا سیکولرزم میں لامذہبیت نہیں ہے بلکہ لادینیت ہے۔ سیکولرزم کے نقطۂ نظر سے اجتماعی زندگی کے تین بڑے بڑے گوشے ہیں۔ ان کے تابع بہت سے معاملات آجاتے ہیں۔ وہ تین

---

[1] یہودیوں کی عبادت گاہ

بڑے گوشے یہ ہیں - معاشرتی، معاشی اور سیاسی - ان کو موجودہ فلسفۂ عمرانیات کی رُو سے علیٰحدہ ہونا چاہیئے - ان کا تعلق کسی دین، مذہب اور عقیدے سے نہیں ہے ان گوشوں میں ان کا عمل دخل قطعی گوارا نہیں ہے اور اسی کا نام سیکولرزم یعنی لادینیت ہے

اس وضاحت کے بعد پہلی بات تو یہ ہے کہ جو کام پہلے گوشے یعنی مذہبی میدان میں کئے جاتے ہیں - مثلاً یہ کہ کوئی عقیدے کی تبلیغ کر رہا ہے - کوئی مشرکانہ اوہام و رسوم اور مبتدعانہ افعال کی مذمت کر رہا ہے اور ان کی اصلاح کے لئے کوشاں ہے، کوئی عبادات کی تلقین کر رہا ہے کہ نماز، زکوٰۃ، روزے اور حج کی ادائیگی کا اہتمام کرو، اس میں سستی اور بے عملی کیوں ہے، کوئی حسنِ اخلاق و معاملات کی صحت کے لئے نصیحت کر رہا ہے - اسی طریقے سے کوئی سماجی برائیوں کی اصلاح کوششوں میں مصروف ہے کہ شادی بیاہ کی رسوم میں جو اسراف و تبذیر اور خلافِ دین چیزیں داخل کر لی گئی ہیں، ان کو ترک کرو، سالگرہ اور برسیاں منانے کا دین میں کوئی سراغ نہیں ملتا - ان بدعات کو چھوڑو ——— ان تمام کاموں کو مذہبی دعوت و تبلیغ کا عمل کہا جائے گا - یہ مذہبی اور سماجی اصلاحی کوششیں ہیں اور ان کاموں کے لئے جماعتیں، جمعیتیں اور تحریکیں موجود ہیں -

دوسری بات یہ ہے کہ انقلاب کا تعلق اُن تین گوشوں سے ہے جو سیکولر میدان کے اندر واقع ہیں - معاشرے کی بنیادی ہیئت (STRUCTURE) میں کوئی تبدیلی لائی جائے تو یہ انقلابی عمل ہے، معیشت کے ڈھانچے میں کوئی بنیادی تبدیلی لائی جائے تو یہ انقلاب ہے - سیاست کے ڈھانچے اور ریاست کی نوعیت میں کوئی بنیادی تبدیلی لائی جائے تو یہ انقلاب ہے - اب اسلام چونکہ ایک جامع دین ہے - اور اس میں عقیدہ، عبادات اور رسومات کے ساتھ ساتھ معاشرت، معیشت اور سیاست بھی شامل ہیں گویا اسلام انسان کے انفرادی معاملات کے ساتھ ساتھ اجتماعی سطح کے معاملات کا بھی احاطہ کرتا ہے - لہٰذا اسلام ان معنوں میں مذہب نہیں ہے جن معنوں میں دنیا کے دوسرے مذاہب ہیں، کہ وہاں عقیدہ (DOGMA)، عبادات (RITUALS) اور رسومات (SOCIAL CUSTOMS) ان تینوں کے مجموعے سے جدید فلسفے کا تصورِ مذہب مکمل ہو جاتا ہے اور جو سب کے

سب انفرادی اور نجی دائرے کے معاملات ہیں۔ اسی طرح معاشرت، اقتصادیات اور سیاسیات، ان تینوں کا مجموعہ یہ دراصل لادینیت کا میدان ہے اور جو خالصتہً انسانی اجتماعیات سے متعلق ہے۔ یہی جدید فکر اس وقت پورے کرۂ ارض پر مسلط اور غالب ہے۔ حتیٰ کہ مسلم ممالک بھی اصلاً اسی فکر و نظریے کی پوری گرفت میں ہیں۔

اسلام زندگی کے انفرادی اور اجتماعی تمام گوشوں پر حاوی ہو کر انکی صلاح و فلاح چاہتا ہے۔ وہ ایمان بھی دینا چاہتا ہے جس کا تعلق عقیدے سے ہے۔ اس کا اپنا عبادات کا ایک نظام بھی ہے اور سماجی رسوم کے لئے بھی اپنا ایک مکمل ضابطہ رکھتا ہے۔ اسی طرح وہ اپنا علیحدہ معاشرتی اور سماجی اور معاشی نظام بھی رکھتا ہے اور اپنا سیاسی نظریہ اور سیاسی نظام بھی رکھتا ہے۔ لہٰذا اسلام کا تعلق مذہبی اصلاحی کام سے بھی ہے اور انقلابی کام سے بھی ہے۔ غرض پوری انسانی زندگی خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، اسلام بحیثیت دین (یعنی نظامِ حیات) اُسے اپنے حیطۂ اختیار میں رکھتا ہے، اس کی گرفت سے انسانی زندگی کا کوئی پہلو اور کوئی گوشہ آزاد نہیں رہتا۔ یہی مفہوم و مقصود ہے اظہار دین الحق علی الدین کلّہٖ کا۔ اللہ کے دین سے زندگی کا کوئی دائرہ باہر نہیں رہ سکتا۔

انقلاب کے نقطۂ نظر سے اگر تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انقلابِ محمدی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کے علاوہ دنیا کے دو انقلابات ایسے ہیں، جن پر لفظِ انقلاب کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ اُن میں سے ایک انقلاب فرانس ہے جس کے نتیجے میں اجتماعی زندگی کا ایک اہم پہلو اور گوشہ یعنی سیاسی ڈھانچہ بدل گیا۔ بادشاہت ختم ہوئی اور جمہوریت کا دور آگیا۔ چونکہ سیاسی ڈھانچے میں بڑی بنیادی تبدیلی واقع ہوئی لہٰذا اس کے لئے انقلاب کے لفظ کا استعمال درست ہے۔ اسی طریقے سے روس کا انقلاب بھی یقیناً انقلاب ہے۔ اس کے نتیجے میں بنیادی معاشی ڈھانچہ بدل گیا۔ انفرادی ملکیت کی پہلے تو نفیٔ مطلق تھی اس کے بعد معتدل ہوئے ہیں تو اس مقام پر آئے ہیں کہ انفرادی ملکیت صرف عام استعمال (ARTICLES OF USE) کی اشیاء کی حد تک تو ممکن ہے۔ مثلاً ایک مکان ہے جس میں کوئی شخص رہتا ہے تو وہ اُس کی ذاتی ملکیت ہو سکتی

ہے - وہ جو کپڑے پہنتا ہے وہ اُس کی ذاتی ملکیت ہو سکتے ہیں - ذاتی ضرورت کے لئے اُس کے پاس سائیکل یا موٹر سائیکل یا موٹر گاڑی ہے تو وہ اسکی ملکیت ہے - گھریلو استعمال کا فرنیچر اور برتن اُس کی ملکیت ہیں[1] - لیکن جو ذرائع پیداوار (MEANS OF PRODUCTION) ہیں، وہ کسی کی انفرادی ملکیت نہیں ہو سکتے - وہ اجتماعی اور قومی ملکیت ہیں - ان کا انتظام و انصرام اجتماعی سطح پر حکومت کرے گی - ان ذرائع سے جو پیداوار ہوگی اُسے معاشرے کی بہبود اور ملکی استحکام پر خرچ کرنے کی کوشش کی جائے گی — یہ بھی معیشت کا میدان ہے اور اس میں جب بڑی بنیادی تبدیلی عمل میں آئی تو یہ بھی انقلاب ہے -

لیکن میرے نزدیک تاریخِ انسانی میں کامل ترین بلکہ اکمل ترین انقلاب صرف ایک ہے اور وہ ہے انقلابِ محمدی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام - اس لئے کہ ہم اس انقلاب میں دیکھتے ہیں کہ عقائد، اخلاق، عبادات، رسوم و رواجات، معاشرت، معیشت اور سیاست غرض سب کا انداز بدل گیا - یہ ایک ہمہ گیر تبدیلی اور مکمل انقلاب (TOTAL REVOLUTION) تھا اس قدر ہمہ گیر اور کامل انقلاب انسانی تاریخ میں کبھی نہیں آیا -

صنعتی انقلاب اور ثقافتی انقلاب

دو انقلابات اور ہیں جن کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں — وہ اصلاً انقلاب نہیں لیکن تبعاً انقلاب قرار دیئے جا سکتے ہیں ان میں سے پہلا وہ ہے جسے صنعتی انقلاب (INDUSTRIAL REVOLUTION) کہا جاتا ہے — اگرچہ فی الواقع وہ انقلاب نہیں تھا، وہ کوئی ڈھانچہ بدلنے کی کوشش نہیں تھی کوئی نئی آئیڈیالوجی اس کی پشت پر نہیں تھی — بلکہ صورتِ واقعہ یہ تھی کہ مشین کی ایجاد نے پورے معاشرے کو اس طور سے متاثر کیا کہ پورے معاشرے کے اندر ایک زبردست تبدیلی رونما ہوگئی

---

[1] استعمال کی ان اشیاء پر قانونِ وراثت لاگو نہیں ہوتا - آدمی کے مرجانے کے بعد یہ سب چیزیں ریاست کی ملکیت ہونگی اور حکومت اپنی صوابدید سے ان اشیاء کا معاملہ طے کرے گی - (مرتب)

اسی کو صنعتی انقلاب کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ مشین کی ایجاد نت نئے مسائل کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ پہلے لوگ دیہاتوں میں رہتے تھے۔ شہروں کی تعداد کم تھی لیکن اس صنعتی انقلاب کی وجہ سے شہروں کے حجم میں اضافہ ہونا شروع ہوگیا اور مزید نئے شہر آباد ہونے سے نئے نئے مسائل سے سابقہ پیش آنے لگا ــــ اس انقلاب سے قبل سرمایہ اور محنت کے درمیان کوئی بڑی اور قابلِ اعتناء الجھن نہیں تھی۔ لوگ بارٹر سسٹم کے تحت ایک دوسرے سے اشیاءِ ضرورت کا تبادلہ کر لیتے تھے۔ مشین کی ایجاد سے بے شمار اقتصادی پیچیدگیاں پیدا ہوگئیں۔ کارخانے کا مالک تو ایک شخص یا چند اشخاص ہوتے ہیں۔ ہزاروں افراد اُس میں کام کرتے ہیں۔ گویا پیداوار (PRODUCTION) میں ہزاروں افراد کی محنت شامل ہے۔ لیکن مالکان اُن کو معمولی سی اُجرت دے کر ٹرخا دیتے ہیں۔ اور اصل منافع سرمایہ دار یعنی کارخانے کا مالک ہضم کر لیتا ہے۔ اس طرح سرمایہ اور محنت کے درمیان رسہ کشی شروع ہوگئی جس کے نتیجے میں وہ انقلاب آیا جسے بالشویک یا اشتراکی انقلاب کہا جاتا ہے ــ لہٰذا یہ صنعتی انقلاب خود تو انقلاب نہیں تھا لیکن انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

ــــــ دوسرا انقلاب ثقافتی (CULTURAL) انقلاب ہے جو چین میں آیا۔ یہ بھی ایک نوع کا انقلاب ہے لیکن میں ان دونوں انقلابات (یعنی صنعتی انقلاب اور چین کا ثقافتی انقلاب) کو تبعاً انقلاب کا درجہ دیتا ہوں ــ مختصراً یہ کہ فی الواقع حقیقی اور کامل انقلاب تو وہی تھا جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے برپا فرمایا اور ایسے مکمل انقلاب کی تاریخ انسانی میں کوئی نظیر موجود نہیں ہے۔ البتہ جہاں تک انقلابِ فرانس اور انقلاب روس کا تعلق ہے تو انہیں ہم جزوی انقلابات میں شمار کر سکتے ہیں۔

"کُو" (COUP) کا مفہوم

اس ضمن میں دوسرا لفظ جو مستعمل ہے وہ ہے کُو (COUP)۔ اس لفظ کا اجمالی مفہوم آغازِ گفتگو میں بیان ہو چکا ہے ــ اسے واضح طور پر سمجھ لیجئے

یہ لفظ دراصل فرانسیسی لفظ ' COUP DE TAT ' سے بنا ہے اس کا تلفظ ہے ' KOODETAH '۔ معنی یہ ہیں کہ کسی ہنگامی، فوری اور مؤثر لیکن غیر آئینی اقدام

کے ذریعے حکومت پر قبضہ کر لینا ـــ ضمنی طور پہ یہ بات سمجھ لیجئے کہ آج جدید پولیٹیکل سائنس نے یہ تصوّر دیا ہے کہ ریاست (STATE) اور حکومت (GOVERNMENT) دو مختلف چیزیں ہیں ۔ شہریوں کی وفاداری اصلاً ریاست کے ساتھ ہوتی ہے حکومت کے ساتھ نہیں ہوتی ۔ اور آج کے دور میں عوام کا یہ حق تسلیم کیا جاتا ہے کہ وہ حکومت کو بدل سکتے ہیں ـــ مثال کے طور پر امریکہ ایک ریاست ہے (گو وہ خود بہت سی ریاستوں (STATES) کا مجموعہ ہے) ۔ وہاں مسٹر ریگن کی حکومت قائم ہے ۔ لیکن امریکہ کے رائے دہندگان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کسی دوسری پارٹی کے اُمیدوار کو ووٹ دے کر ریگن کو اقتدار سے ہٹا دیں اور ریاست کا نظم و نسق کسی اور کے ہاتھ میں دے دیں ۔ گویا ریاست یا نظامِ ریاست برقرار رہتا ہے، اُسے چلانے والے ہاتھ بدلتے رہتے ہیں ۔ تو ریاست اور حکومت کے اس بنیادی فرق کو ملحوظ رکھئے! ـــ تو 'کُو' (COUP) یہ ہوتا ہے کہ کوئی منظم ادارہ[1] کسی وقت موقع پا کر اقدام کر کے حکومت پر قبضہ کر لیتا ہے ۔ یہ صرف موقع کی بات ہوتی ہے ۔ اس منظم ادارے نے نہ تو اس سے قبل پبلک کے سامنے کوئی اپنا پروگرام رکھا ہوتا ہے نہ انہوں نے میدان میں اُتر کر اس کام کے لئے کوئی محنت کی ہوتی ہے ۔ اور نہ ہی اس کے لئے کوئی نئی پارٹی (FLOAT) (ترتیب) کی جاتی ہے ـــ یعنی انقلاب کے جو بھی لوازم (PRE - REQUISTES) ہوتے ہیں وہ یہاں نہیں پائے جاتے ـــ مختصراً یہ کہ کسی ملک میں فوج کسی موقع پر حکومت پر قابض ہو جائے تو اسے COUP (کُو) کہا جاتا ہے ۔ لیکن اُردو میں چونکہ اس لفظ (یعنی COUP) کا کوئی مترادف موجود نہیں ہے لہٰذا ایسی صورتِ حال کے لئے 'فوجی انقلاب' کی اصطلاح اختیار کی جاتی ہے ۔ حالانکہ 'انقلاب' کا اس پر اطلاق نہیں ہوتا ـــ انقلاب اور 'کُو' (COUP) کا یہ فرق واضح رہنا چاہیئے کیونکہ آگے گفتگو انہی اصطلاحات کے حوالے سے ہوگی ۔

---

[1] یہ واضح رہے کہ کسی ملک میں فوج سے زیادہ منظم ادارہ اور کوئی نہیں ہو سکتا ۔ البتہ ممکن ہے کہ فوج کے علاوہ کوئی دوسرا منظم ادارہ بھی کسی ملک میں موجود ہو ۔

موضوع زیرِ بحث کی اہمیت

ابھی تک تمامتر گفتگو تمہیدی نوعیت کی تھی کہ جو الفاظ ہم اس سلسلے میں استعمال کرتے ہیں ان کے اصل معانی و مفاہیم کیا ہیں۔ اب میں اصل موضوع کی طرف آرہا ہوں۔

"اسلامی انقلاب" کی ترکیب ہمارے یہاں پہلے سے مستعمل تھی لیکن ایران کے حالیہ انقلاب کے حوالے سے یہ لفظ اب ایک اصطلاح کے طور پر پوری دُنیا میں معروف ہو گیا ہے۔ اور دُنیا نے ایرانی انقلاب کے معاملے کو اسلامی انقلاب ہی متصور کیا ہے اور اس کے حوالے سے یہ جاننے کی کوشش کی ہے کہ اسلامی انقلاب کیا ہوتا ہے! اس کا نتیجہ جو نکلتا ہے وہ بہت قابلِ توجہ ہے کہ ایران میں جو کچھ بھی ہوا اُس میں اگر کوئی خوبی تھی تو وہ اسلام کے کھاتے میں درج ہوئی اور اگر کوئی خرابی یا نقص تھا تو اُس کا اندراج بھی اسلام ہی کے کھاتے میں ہوا اس لئے کہ پروپیگنڈا ایسی ہے کہ ایران کا انقلاب 'خالص اسلامی انقلاب' ہے —— اِس پہلو سے یہ مسئلہ بہت اہم اور نازک ہو جاتا ہے چنانچہ اس بات کا واضح ہونا بہت ضروری ہے کہ کیا فی الواقع ایران کے انقلاب کو ایک 'اسلامی انقلاب' قرار دیا جا سکتا ہے! یہ سمجھ لیجئے کہ یہ میرا یا کسی اور شخص کا ذاتی مسئلہ نہیں ہے بلکہ اُن تمام لوگوں کا مشترکہ مسئلہ ہے جن کا دین کے ساتھ کوئی عملی تعلق ہے۔ خاص طور پر وہ لوگ جو دین کے معاملے میں فعّال ہیں اور غلبۂ دین کے لئے کچھ کام کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، اُن کے ذہن اس مسئلے پر بالکل واضح ہونے چاہئیں۔

اس بات کو سمجھنے کے لئے کہ کیا فی الواقع ایران کا انقلاب ایک اسلامی انقلاب ہے! ہمیں مثبت طور پر یہ سمجھنا ہو گا کہ اسلامی انقلاب کسے کہتے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تاریخِ انسانی کا عظیم ترین انقلاب برپا کیا تھا اس کے مدارج کون کون سے تھے! اس طرح ہماری گفتگو کئی گوشوں میں منقسم ہو جاتی ہے۔ تاہم آج کے اجتماعِ جمعہ میں اعلان کے مطابق میں ایران کے انقلاب کے بارے میں کچھ باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

ہمارے ایرانی بھائیوں کا یہ دعویٰ ہے کہ جو تبدیلی وہ ایران میں لاتے ہیں وہ ایک 'خالص اسلامی انقلاب' ہے۔ اس جملے پر غور کیجئے۔ اسی کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ جو

لوگ پاکستان میں انقلاب لانا چاہتے ہیں وہ ایرانی انقلاب کے طریق کار اور اس کے انقلابی عمل کو اختیار کرنے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچتے ہیں ـــ اس دعوے کے دو حصے ہیں اور ہمیں اسے دو مراحل میں سمجھنا ہے اور اس کا تجزیہ کرنا ہے اوّلاً یہ کہ وہاں جو تبدیلی آئی ہے وہ واقعتہً 'اسلامی' ہے یا نہیں ! ثانیاً یہ کہ آیا وہاں جو تبدیلی آئی ہے اس پر فی الواقع لفظ انقلاب کا اطلاق ہوتا بھی ہے یا نہیں ! سر دست میں صرف اس کے مؤخر الذکر حصے پر گفتگو کروں گا ۔ باقی یہ کہ آیا یہ تبدیلی حقیقتاً 'اسلامی' ہے یا نہیں اس پر گفتگو ان شاء اللہ آئندہ ہوگی ۔

ایرانی انقلاب کی حقیقت

میرا تجزیہ جس کو میں ایک جملے میں بیان کرتا ہوں یہ ہے کہ "ایران کی تبدیلی REVOLUTION (انقلاب) کی نوعیت کی نہیں ہے بلکہ اس کی اصل نوعیت COUP (کُو) کی ہے" ۔ میرا یہ دعویٰ اس بنیاد پر ہے کہ اس میں انقلاب کے ناگزیر لوازم (PRE REQUISITE) موجود نہیں ہیں ـــ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ انقلاب کے دو ناگزیر لوازم ہیں ـــ اس بات کو میں خوب کھول کر بیان کروں گا تاہم پایۂ ثبوت تک یہ بات اسوقت پہنچے گی جب میں اس کا تقابل انقلابِ محمدی علے صاحبہ الصلوٰۃ والسلام سے کروں گا ۔

انقلاب کا پہلا لازم یہ ہے کہ اس میں نیا نظریہ (NEW IDEOLOGY) سامنے آئے یا کسی قدیم آئیڈیالوجی کی عہد حاضر کے مطابق نئی تعبیر (RE- INTERPERTION) کی گئی ہو ۔ اور پھر یہ کہ وہ فی الواقع انقلابی نظریہ (REVOLUTIONARY IDEOLOGY) ہو ـــــــ یہاں اعتراض ہو سکتا تھا کہ اگر نئی آئیڈیالوجی کے بغیر انقلاب نہیں آسکتا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اسلامی انقلاب نہیں آسکتا ۔ اسی کے لئے میں نے یہ دوسری شکل بیان کی کہ اگر آئیڈیالوجی قدیم ہو تو لازم ہے کہ اُس کی ایک نئی تعبیر سامنے لائی جائے ۔ ورنہ اس کے بغیر انقلاب کے کیا معنی ! نیا نظریہ نیا فلسفہ ، نیا نقطۂ نظر نہیں تو انقلاب کیسا ! ـــــــ اسلامی انقلاب میں کیا ہو گا ؟ یہاں آئیڈیالوجی وہ ہے جسے ہم 'ایمان' کہتے ہیں ۔ وہ نظریات و عقائد جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے ہم تک پہنچے اُن کی تصدیق کا نام ایمان ہے ۔ "تصدیق

بِمَاجَاءَ بِہٖ النبی صلے اللہ علیہ وسلم "اور اس بات کی تصدیق کرنا جو حضورؐ لے کر آئے) ۔ معاملہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حقائقِ کائنات کے بارے میں جو تصورات دیتے تھے ہمارے ہاں ایمانیات اور عقائد کی شکل میں کتابوں میں مدون ہو گئے ۔ سوال یہ ہے کہ کیا اسی تدوین کی بنیاد پر، جو آج سے چودہ سو سال قبل کی گئی تھی انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے ؟ میرے نزدیک اس میں نئی تعبیر کی ضرورت ہے ۔ یہ نئی تعبیر کس اعتبار سے ہو گی اسے ذرا تفصیل سے سمجھنا ہو گا —— اسلامی آئیڈیالوجی یعنی ایمان کی نئی تعبیر کی ضرورت فی الواقع روحانیات یا اخلاقیات کے میدان میں نہیں ہے اس لئے کہ ان معاملات میں نئی تعبیر تو دراصل دین کی اساسات سے انحراف کے مترادف ہے ۔ نئی تعبیر کی ضرورت کا تعلق حقائقِ کائنات کی مادی تعبیر سے ہے ۔ اس لئے کہ انسان کا مادی علم اُس دور سے آج تک مسلسل ترقی کر رہا ہے ۔ مادی علوم کا دائرہ کہاں تک پھیل گیا اس کا اندازہ اس سے کیجیئے کہ کہاں انسان زمین سے چند فٹ کی چھلانگ لگا سکتا تھا اور کہاں اب یہ صورت کہ وہ چاند کو اپنے قدموں سے پامال کر چکا ہے اور مریخ پر چھلانگ لگانے کی سوچ رہا ہے ۔ مادی میدان میں جو یہ تبدیلی آئی ہے اس نے ذہنوں میں بہت سے سوالات اور اشکالات کو جنم دیا ہے ۔ اسی طرح بہت سے نئے مسائل پیدا ہو چکے ہیں جو اس وقت نہیں تھے ایک کی مثال تو میں دے چکا ہوں کہ مشین کی ایجاد نے کتنے نئے اور گوناگوں مسائل پیدا کر دیئے —— مختصراً یہ کہ اب اسلام کی ایک ایسی تعبیر کرنی ہو گی جو اپنی اصل (جڑ) سے تو قطعی نہ ہٹے ۔ اور معاملہ وہی ہو کہ " اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِی السَّمَآءِ "۔ (ترجمہ : اُسکی جڑ زمین میں قائم ہے اور شاخیں آسمان سے باتیں کرتی ہیں" سورۃ ابراہیم) —— لیکن جب وہ پھیلے تو ان تمام مادی علوم کو اپنے دائرے میں لے لے ۔ یہ ہوگی اسلامی آئیڈیالوجی کی تعبیرِ نو ۔ اور یہ اس دور میں اسلامی انقلاب کا پہلا ناگزیر لازمہ ہے ۔

میں آپ کی توجہ اس جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ آخر کیا وجہ تھی کہ علامہ اقبال نے اپنے لیکچرز کا عنوان ' RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM ' رکھا تھا ! آپ نے کبھی غور کیا اس عنوان کے رکھنے کی وجہ کیا تھی ۔ لوگ حیران ہونگے کہ یہ کیا عنوان ہوا کہ " اسلام میں الہیات کی تشکیلِ جدید" !

غالباً سیّد نذیر نیازی نے ان خطبات کے ترجمے کے لئے یہی عنوان تجویز کیا تھا۔ اصل میں بات تو وہی ہے۔ توحید تو وہی ہے اس کی شاخیں بڑھتی جاتی ہیں، ع "یہ سب کیا ہیں فقط اک نقطۂ ایماں کی تفسیریں"۔ جیسے جیسے انسان کے مادّی علوم کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو رہا ہے، نت نئے حالات و مسائل پیدا ہو رہے ہیں، ان سب کا احاطہ کرتے ہوئے ہمیں اپنے بنیادی عقیدے یعنی توحید کی وہ تشریح کرنی ہوگی جو آج کے جدید تعلیم یافتہ ذہن کو مطمئن کر سکے — اس کے بغیر اسلامی انقلاب کی جانب پیش قدمی ممکن نہیں — اس لئے کہ نماز روزے کی تلقین ہو سکتی ہے، اتباعِ سُنّت کی ترغیب دی جا سکتی ہے، بدعات کا رد ہو سکتا ہے۔ غرضیکہ ذاتی اصلاح کے بے شمار کام ہو سکتے ہیں، لیکن بحیثیتِ مجموعی معاشرے کے معاشی اور سیاسی ڈھانچے میں کوئی تبدیلی اُس وقت تک نہیں لائی جا سکتی جب تک کہ اسلام کے بنیادی عقائد کی تعبیرِ نو اور تشکیلِ جدید کا کام جدید دور کی علمی سطح پر نہ کیا جائے — یہ کام علامہ اقبال نے شروع کیا تھا۔ اس معاملے میں پیش رفت ہونی چاہیئے تھی لیکن علامہ کے بعد اس کوچے میں ہمیں صرف ایک شخصیت نظر آتی ہے جس نے اس سمت میں کچھ پیش قدمی کی — میرا اشارہ ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کی جانب ہے جن کی کتاب "قرآن اور علم جدید" کا تذکرہ میں کئی بار ان مجالس میں کر چکا ہوں — اس کے علاوہ اس میدان میں تا حال کوئی قابلِ ذکر کام نہیں ہو سکا — اور ایران میں تو یہ کام بالکل نہیں ہوا — میں نے سُنا تھا کہ ایران میں اس سطح پر ڈاکٹر علی شریعتی نے کچھ کام کیا ہے۔ مجھے اشتیاق تھا کہ ان کی کتابوں کا مطالعہ کروں۔ یہاں تو ان کی کتابیں دستیاب نہ ہو سکیں البتہ امریکہ میں ان کے کچھ کتابچے میری نظر سے گزرے۔ دیکھا تو مایوسی ہوئی۔ سطحی باتیں ہیں۔ فکر کی گہرائی کا معاملہ مفقود نظر آیا۔ علامہ اقبال مرحوم کی کتاب جس کا میں نے ابھی حوالہ دیا ہے، میرے نزدیک اس عظیم کام کے لئے ابتدائی قاعدے (PRIMER) کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگرچہ بہت دقیق کتاب ہے، پڑھتے ہوئے دانتوں پسینہ آتا ہے لیکن اس کام کے لئے اُسے ایک نقطۂ آغاز (STARTING POINT) ہی کہا جا سکتا ہے مقصود اس سے حاصل نہیں ہوتا — پھر یہ کہ اس کی بعض باتوں اور نظریات سے ہمیں اختلاف بھی ہے۔ تاہم اس کے باوجود وہ صحیح رُخ پر ایک کوشش تھی — لیکن

ایران میں یہ کام بالکل نہیں ہو پایا ـــــ اور میرے نزدیک یہ چیز اسلامی انقلاب کی پہلی ناگزیر شرط ہے۔

انقلاب کے لئے دوسرا ناگزیر لازمہ (PREREQUISITE) یہ ہے کہ انقلاب درحقیقت کسی ایسے منظم ادارے کے ہاتھوں نہیں آیا کرتا جو پہلے سے موجود ہو۔ بلکہ انقلاب ہمیشہ کسی نئی انقلابی پارٹی کے ذریعے، نئی درجہ بندی (CADRE) کے ساتھ اور ایسے لوگوں کے ہاتھ آتا ہے جو اس انقلابی پارٹی (REVOLUTIONARY PARTY) میں شریک ہوں اور ذہناً اُس کی آئیڈیالوجی کو قبول کر چکے ہوں ـــــ اب درجہ بندی اس اعتبار سے ہوگی کہ کس نے انقلاب کے لئے کتنا ایثار کیا! ـ ایسا نہیں ہوگا کہ جو سید زادہ ہے وہ آگے ہے اور جو شودر ہے وہ رتبے کے اعتبار سے کم تر ہے۔ یا دولت مند کا رتبہ بلند ہے اور غریب پیچھے ہے۔ بلکہ اب جو درجہ بندگی ہوگی اُس میں یہ پہلو مقدم ہوگا کہ انقلاب کے لئے قربانیاں کس نے زیادہ دی ہیں! کس نے ـــــ اس کے لئے مشقت جھیلی ہے اور جان و مال کے نقصان کی پرواہ کئے بغیر ہمہ تن انقلاب کے لئے جدوجہد کی ہے ـــــ انقلاب کی تکمیل اُسی وقت ہوگی۔ جب ایک نیا ڈھانچہ (STRUCTURE) نئی درجہ بندی (CADRES) کے ساتھ وجود میں آئے ـــ اگر کوئی پہلے سے موجود (PRE-EXISTING) ادارہ اقتدار پر قابض ہو جاتا ہے تو یہ درحقیقت COUP (تختہ الٹنا) ہے۔ اسے انقلاب کہنا درست نہ ہوگا۔

اس نئی درجہ بندی کے معاملے کو ایک مثال سے سمجھئے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے عہد خلافت کا واقعہ ہے۔ دربار خلافت لگا ہوا تھا بلکہ صحیح تر الفاظ میں مجلس شوریٰ کا اجلاس ہو رہا تھا۔ صحابہ کرامؓ تشریف لاتے تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ کا یہ دستور تھا کہ وہ کبار صحابہ کو، خاص طور پر سابقون الاولون کو، کہ جنہوں نے اسلام لانے میں سبقت کی تھی اور دین کے لئے تن من دھن نچھاور کر دیا تھا، اپنے قریب جگہ دیا کرتے تھے ـــــ اسی دوران حضرت سہیل بن عمروؓ تشریف لاتے ہیں ـــــ یہ کون ہیں! قریش کے اونچے لوگوں میں سے ہیں۔ فتح مکہ تک مشرکین میں سے تھے لیکن پھر ایمان لے آئے۔ یہ وہی ہیں جو صلح حدیبیہ کے موقع پر قریش کی طرف سے سفیر اور بااختیار نمائندے کی

حیثیت سے آئے تھے اور صلح کی شرائط طے کرائی تھیں - اگر ان کی ذہانت و فراست کا اندازہ کرنا ہو تو صلح حدیبیہ کی تفصیلات پڑھ لیجئے کہ صلح نامہ مرتب کرتے ہوئے انہوں نے کتنی باریک بینی سے کام لیا تھا ـــــ تو یہ سہیل بن عمرؓ تشریف لاتے ہیں اور حضرت عمرؓ کے بالکل ساتھ بیٹھ جاتے ہیں - اتنے میں ایک صحابیؓ آجاتے ہیں جو زمانی لحاظ سے ایمان لانے میں حضرت سہیلؓ سے مقدم ہیں - حضرت عمرؓ حضرت سہیلؓ سے کہتے ہیں کہ آپ ذرا ہٹ جائیے اور آنے والے صحابی کو اپنے ساتھ بٹھالیتے ہیں - اتنے میں کوئی اور صحابی آجاتے ہیں - ان کا معاملہ بھی یہ ہے کہ یہ سابقون الاولون میں سے ہیں - حضرت عمرؓ انہیں بھی اپنے قریب جگہ دیتے ہیں اور جناب سہیلؓ کو مزید پیچھے کھسکنا پڑتا ہے - یہ عمل کئی بار دہرایا جاتا ہے اور بالآخر حضرت سہیلؓ جوتیوں تک پہنچ جاتے ہیں - اس پر ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے، احتجاجاً کہتے ہیں -

"کیا آپ کی مجلس میں ہمارا یہ مقام رہ گیا ہے کہ ہم جوتیوں تک پہنچا دیئے جائیں" جواباً حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تم لوگوں نے اسلام میں پیچھے رہ کر اپنا مقام گنوا دیا ہے - یہاں اُن کا مقام مقدم ہے جو اسلام میں پہلے داخل ہوئے تھے پھر سرحدوں کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ وہاں جاؤ جہاں جہاد و قتال ہو رہا ہے - وہاں جاکر سرفروشی جانفشانی کا مظاہرہ کرو تو تمہارا بھی کوئی مقام معین ہو جائے گا ـــــ گویا اب وہ پرانے اعزازات کام نہیں دیں گے - یہاں تو اب معاملہ یہ ہے کہ اگر کسی غلام (مثلاً حضرت بلالؓ) نے بھی ایمان لانے میں سبقت کی ہے اور دین کیلئے قربانیاں دی ہیں تو اُس کا مقام و مرتبہ اُس قریشی سردار سے بہت بلند و ارفع ہے جس نے کہیں بعد میں جاکر (یعنی فتح مکہ کے نزدیک) اسلام قبول کیا ہے -

سورہ حدید میں فرمایا: لَا يَسْتَوِي مِنكُم مَّنْ أَنفَقَ مِن قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ ۚ أُولَٰئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِينَ أَنفَقُوا مِن بَعْدُ وَقَاتَلُوا

تم میں سے کوئی شخص ان لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتا جنہوں نے فتح مکہ سے پہلے خرچ کیا اور (اللہ کی راہ میں) قتال - یہ لوگ درجہ کے اعتبار سے ان لوگوں سے بڑے ہیں جنہوں نے (فتح مکہ) کے بعد اللہ کی راہ میں خرچ کیا اور قتال کیا -

یہ ہے ایک انقلابی جماعت کی شان کہ اس میں نئی درجہ بندی ہوتی ہے ۔ CADRES نئے ہوتے ہیں ۔ اور اسکی بنیاد صرف ایک ہوتی ہے کہ کون ہے جس نے اس انقلاب کے لئے زیادہ سے زیادہ قربانی دی ہے ۔

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ

"اور مہاجرینؓ وانصارؓ میں سے جو سب سے پہلے سبقت کرنے والے ہیں اور پھر جن لوگوں نے خوبی کے ساتھ ان کی پیروی کی ہے اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوئے ۔"

یہ دو چیزیں کسی بھی انقلاب کے ناگزیر لوازم (PRE REQUISITES) ہیں یہ اگر نہیں ہوں گے تو جو نتیجہ برپا ہوگا، اُسے آپ انقلاب نہیں کہہ سکتے بلکہ وہ COUP کے قبیل کی ایک شے ہوگی ۔ اور یہ دونوں چیزیں ایرانی انقلاب میں موجود نہیں ہیں ۔

ایرانی انقلاب اور پاکستان کی تحریکِ نظامِ مصطفےٰ: ایک تقابل

اب مَیں آپ کے سامنے اپنا ایک تجزیہ رکھ دیتا ہوں ۔ یہاں ہمارے یہاں بھی ایک تحریک "تحریکِ نظامِ مصطفےٰ" کے نام سے چلی تھی ۔ اور ایران میں بھی ایک تحریک چلی تھی ۔ جو اس تبدیلی پر منتج ہوئی جس کے بارے میں ہم گفتگو کر رہے ہیں ـــــ عجیب بات یہ ہے کہ نہ صرف یہ کہ ان دونوں تحریکوں میں نہایت گہری مشابہت اور بے انتہا مماثلت ہے بلکہ ان میں زمانی قرب بھی ہے ۔ یعنی دونوں ایک ہی دور میں شروع ہوئی تھیں دونوں 'CONTEMPORARY MOVEMENTS' ہیں ـــــ غور کیجئے دونوں جگہ ان تحریکوں کا اصل مقصود کیا تھا !! سادہ جواب ہوگا کہ وہ مقصود تھا ایک ناپسندیدہ حکمران سے نجات حاصل کرنا ـــــ اب کسی کے نزدیک وہ ناپسندیدہ ہو سکتا ہے مذہبی اعتبار سے، کسی کے نزدیک آمرانہ رویئے اور جمہوریت کُشی کی وجہ سے ممکن ہے کچھ لوگ کسی مخصوص نظریئے کے باعث اور کچھ اُسے ذاتی کردار کی وجہ سے ناپسند کرتے ہوں ۔ مَیں نے بہت ہی محتاط اندازِ بیان اختیار کیا ہے کہ اصل مقصود

تھا ایک ناپسندیدہ حکمران سے چھٹکارا حاصل کرنا ۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ دونوں تحریکوں میں یہ مقصد مشترک نظر آتا ہے ۔ یہاں یہ تحریک بھٹو کے ردّ (Anti-Bhutto) میں تھی اور وہاں شاہ کے ردّ (Anti-Shah) میں تھی ۔ ان دونوں میں بنیادی طور پر مذہب کا عمل دخل نہیں تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں اس کا نام تھا "پاکستان متحدہ محاذ" ۔ وہاں کی تحریک کا ابتدا میں کیا نام تھا اس کا مجھے علم نہیں ۔ بہرحال اس کا معاملہ ہمارے یہاں کی تحریک سے بہت مشابہ تھا ۔

ثبوت اس دعوے کا یہ ہے کہ مختلف طرزِ فکر (SHADES OF OPINION) کے لوگ یہاں جمع تھے اور یہی صورت حال ایران میں بھی تھی ۔ ایک ہی پلیٹ فارم پر دائیں بازو والے (RIGHTIST) اور بائیں بازو والے (LEFTIST) جمع تھے ۔ کیا یہ دونوں کسی مثبت کام خاص طور پر دینی و مذہبی کام پر جمع ہو سکتے ہیں ؟ دونوں کے نظریات جدا، قبلے جدا، نظام جدا، فکر جدا، فلسفہ جدا ۔ دونوں میں بُعد المشرقین ہے ۔ پھر دائیں بازو (RIGHTIST) میں بھی دو طرح کے لوگ تھے ۔ سیکولرذہن کے لوگ بھی شامل تھے اور مذہبی فکر رکھنے والے بھی ۔ پھر مذہبی فکر رکھنے والوں میں مزید تقسیم ہے ۔ ہمارے یہاں ایک لبرل اسلام ہے یعنی مسلمان تو ہیں ۔ لیکن نماز روزہ سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے ۔ نہ ہی ستر و حجاب اور دیگر معاشرتی احکام اور حدود و قیود اس طبقے کے لوگوں کو گوارا ہیں ۔ دوسرا راسخ العقیدہ (ORTHODOX) اسلام ہے جس میں واقعتاً اسلام کی مقرر کردہ عبادات سے، اس کے مظاہر سے، اس کے شعائر سے، اس کے احکام و حدود و قیود اور اوامر و نواہی سے پورا شغف پایا جاتا ہے ۔ اور یہ لوگ اسلام کو بحیثیت دین، یعنی نظامِ زندگی نافذ العمل دیکھنا چاہتے ہیں ۔ اس طرح کُل چھ طرزِ عمل (SHADES) بن جاتے ہیں ۔ اور یہ چھ کے چھ یہاں بھی جمع ہو گئے تھے اور وہاں بھی یہ سب جمع تھے ۔ وہاں تو خالص کمیونسٹ پارٹی بھی شریک تھی ۔ ہمارے یہاں تو اس نام سے کوئی پارٹی نہیں ہے ۔ گو اس کا فکر پھیلتا رہتا ہے اور درحقیقت جنہیں بایاں بازو (LEFTIST) کہا جاتا ہے وہ عموماً اسی نقطۂ نظر کے حامل لوگ ہیں ۔ لیکن کمیونسٹ پارٹی کے نام سے کوئی پارٹی ہمارے یہاں موجود نہیں ہے لیکن تو وہ پارٹی تو علی الاعلان کمیونسٹ پارٹی رہی ہے ۔ اس نے اس

بات کو کبھی چھپا کر نہیں رکھا، وہ بھی وہاں کی تحریک میں شریک تھی - تو معلوم ہوا کہ شروع میں یہ دونوں تحریکیں خالص سیاسی تحریکیں تھیں اور ایک ناپسندیدہ حکمران سے نجات پانا ان تحریکوں کا اصل ہدف تھا - یہ بات سب کے ذہن میں تھی کہ جو نظام قائم کرنا ہوگا اس کے متعلق بعد میں طے کر لیں گے پہلے اس بڑی رکاوٹ (HUR-DLE) کو راستہ سے ہٹا لیں -

آپ کو ان تحریکوں میں یہ عجیب بات قدرِ مشترک کے طور پر نظر آئے گی کہ مسلمان ممالک میں اس قسم کی جو تحریکیں اٹھتی ہیں وہ جب اس مرحلے پر پہنچ جاتی ہیں کہ جہاں قربانیاں دینے کی ضرورت پیش آتی ہے تو ہمیشہ مذہب کے نام کا سہارا لیا جاتا ہے اور اسے بطور نعرہ استعمال کیا جاتا ہے - گویا "بنتی نہیں ہے ساغر و مینا کہے بغیر!" — اس لئے کہ لوگ جان پر کھیلنے کے لئے صرف اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نام ہی پر تیار ہوتے ہیں - کسی اور نام پر کم سے کم مسلمان سینے پر گولی کھانے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا - ۱۹۵۳ء میں ختم نبوت کی تحریک کے موقع پر میں نے اپنی آنکھوں سے مسلمانوں کو گریبان کھول کھول کر سینے پر مردانہ وار گولیاں کھاتے ہوئے دیکھا ہے - میں اس وقت میڈیکل کالج کا طالب علم تھا کالج کا جو دروازہ اس وقت گوالمنڈی کی طرف کھلتا تھا اسکی سلاخوں کے ساتھ کھڑے ہم دیکھ رہے تھے کہ جلوس بانسہ والا بازار سے آیا، ایک مقام پر پولیس نے پوزیشن لی اور فائرنگ شروع کی — کچھ لوگ گرے لیکن پیچھے والوں نے پسپائی اختیار نہیں کی بلکہ وہ آگے آئے اور انہوں نے گریبان کھول کر نعرے لگائے "مارو گولی ناموس نبوت پر جان حاضر ہے" — پھر گولیوں کی بوچھاڑ آئی اور بہت سے لوگ ڈھیر ہو گئے یہ واقعہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے — اور اسی دن ہمیں ایمرجنسی تھیٹر میں معلوم ہوا کہ ان میں دو سگے بھائی تھے، ایک پہلے برسٹ میں اور دوسرا دوسرے برسٹ میں گرا - تو یہ حقیقت ہے کہ لوگوں کا جوش و جذبہ فی الواقع دین و مذہب کے نام پر ہی اس شدت کو پہنچتا ہے کہ وہ ہر قسم کے ستم کے پہاڑ جھیلنے بلکہ ہدیۂ جان تک پیش کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں - کانپور کی مسجد اور مسجد شہید گنج لاہور کے لئے لوگوں نے خون دیا ہے، گولیاں کھائی ہیں - چاہے خود نماز کے پابند نہ ہوں - مسجد یک شب، کے واقعے پر اقبال نے کہا تھا ؎

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایمان کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا!

یہ ہے اصل حقیقت کہ یہاں بھی ۱۹۷۷ء میں انتخابی دھاندلیوں کے بعد ایک زوردار اور زبردست عوامی تحریک چلانے کے لئے رُخ بدلا گیا اور تحریک کا عنوان تبدیل کر دیا گیا — کہاں پاکستان قومی اتحاد (P.N.A.) اور کہاں "تحریک نظام مصطفےٰ" ! زمین آسمان کا فرق ہے۔ لیکن اس کے بغیر چارہ کار نہیں تھا۔ عوام قید و بند کی سختیاں جھیلنے لاٹھیاں کھانے، حتیٰ کہ گولیاں کھانے کے لئے میدان میں کبھی اس جوش و جذبے سے نہ آتے اگر یہ قدم نہ اٹھایا جاتا — اسی طریقے سے ہاں ایران میں بھی " ANTI) اینٹی شاہ تحریک کو" اسلامی انقلاب" کا نام دیا گیا۔ تاکہ عامۃ الناس قربانیاں دینے میں پس و پیش نہ کریں۔

یہی وجہ ہے کہ یہاں تحریک کی لیڈر شپ کس کے سپرد کی گئی! ایک عالم دین کے! حالانکہ آپ خود سوچئے کہ کیا پیر پگارا صاحب مولانا مفتی محمود مرحوم و مغفور کو اپنا لیڈر مان سکتے تھے! کیا اصغر خان صاحب یا ولی خان صاحب مفتی صاحب کو اپنا لیڈر تسلیم کر سکتے تھے! متوخر الذکر کی طرف تو بڑے توہین آمیز الفاظ پر مشتمل ایسے جملے بھی منسوب ہیں کہ " یہ ملاّ ٹے ہماری روٹیاں توڑنے والے کیا ان کو ہم سمجھ لیں گے کہ یہ ہمارے برابر کے لوگ ہیں اور ہمارے لیڈر ہیں" خوانین کو اپنے مقام اور مرتبہ کا ایک پندار ہے اور وہ مولویوں کے اس بلند مرتبے (STATUS) کو دل سے کبھی بھی تسلیم نہیں کر سکتے — پھر جو مذہبی لوگ تھے اُنکے بارے میں کیا آپ کا گمان ہے کہ مولانا نورانی میاں اور ان کے مکتب فکر کے لوگ مفتی محمود صاحب کو اپنا لیڈر تسلیم کر سکتے تھے! وہ تو ان کے پیچھے نماز پڑھنے کے بھی روادار نہیں تھے۔ رہا چند دوسری نیم مذہبی اور نیم سیاسی جماعتوں کا معاملہ! ان میں سے ہر ایک کے اپنے مستقل تصورات و معیارات تھے۔ وہ بھی دل سے مفتی صاحب مرحوم کو مستقل طور پر اپنا قائد اور رہنما ملتنے کے لئے شاید ہی تیار ہوتے! — معلوم ہوا کہ یہ وقتی مصلحتوں کا معاملہ تھا۔ وقتی ضرورت کے تحت مفتی صاحب مرحوم کو متفقہ لیڈر کا درجہ دے لیا گیا ورنہ فی الواقع وہ ایک علامتی (SYMBOLIC) لیڈر شپ تھی جس کا حقیقت سے

کوئی واسطہ نہ تھا۔

اس کے بالکل برعکس ایران کا معاملہ تھا ہوا۔ وہاں ایک شخصیت علماء میں سے پہلے سے ایسی موجود تھی کہ جس نے شاہ کی حکومت، اس کی پالیسیوں اور اس کے ذاتی کردار پر نہایت جرأت کے ساتھ برملا تنقیدیں کی تھیں۔ جس کی وجہ سے عوام الناس میں یہ اعتماد پیدا ہوتا چلا گیا تھا کہ ایک شخص ایسا ہے کہ جو جرأت کے ساتھ شاہ سے ٹکر لے سکتا ہے۔ شاہ ایران اس شخصیت سے اتنا خائف تھا کہ ان پر ہاتھ ڈالنے کا اس میں حوصلہ نہیں تھا۔ اس لئے اس نے ان کو جلاوطن کر رکھا تھا۔ لیکن انکی شعلہ بیان تقاریر کیسٹوں کے ذریعے پورے ایران میں پھیل چکی تھیں جس کے اثرات اتنے ہمہ گیر ہوئے کہ باوجودیکہ وہ ملک سے باہر تھے لیکن تحریک کی مکمل رہنمائی انکے ہاتھ میں تھی اور باہر ہی سے انکی بروقت ہدایات کا ایک سلسلہ قائم تھا۔ مراد ہے جناب خمینی صاحب کی فعال اور متحرک (DYNAMIC) شخصیت ــــ پھر یہ قیادت اتنی ہر دلعزیز ہوئی کہ نہایت مستحکم طور پر پوری تحریک پر چھا گئی اسکی وضاحت میں آگے چل کر کرونگا کہ کن خاص اسباب کی بنا پر یہ قیادت اتنی مستحکم ہو گئی تھی ــــ بہرحال وہاں لیڈرشپ پوری تحریک پر چھا گئی اور اس نے حقیقی ــــ لیڈرشپ کی صورت اختیار کر لی جبکہ یہاں پاکستان میں صرف علامتی (TOKEN) لیڈرشپ تھی۔ یہی بنیادی فرق دونوں جگہ مختلف شکلوں میں نتیج ہوا ــــ یہاں جب معاملہ آگے بڑھا اور بھٹو صاحب کی کرسی واقعتہً ڈولنے لگی تو آرمی نے موقع دیکھا اور وہ COUP کے ذریعہ برسر اقتدار آگئی۔ نتیجتہً تحریک نظام مصطفیٰ کے قائدین کے پلے کچھ نہیں پڑا۔ قائد فوج نے اقتدار سنبھالنے کے بعد قوم سے خطاب کرتے ہوئے وعدہ کیا کہ نوے دن کے اندر اندر نئے انتخاب کرا کے مرکزی اور صوبائی حکومتیں عوام کے نمائندوں کے حوالے کر دی جائیں گی اس طرح تحریک کا جو زور (MO-MENTUM) تھا وہ سرد پڑ گیا۔

ایران میں یہ ہوا کہ تحریک کامیاب ہوئی اور وہاں جو مستحکم مذہبی تنظیم (Religious Hierarchy) تھی اس کی توضیح میں آگے بیان کروں گا ــــ اس نے اقتدار پر قبضہ کر لیا ــــ یہی وجہ ہے کہ یہ تبدیلی نہایت خونی انقلاب کی صورت میں دنیا کے سامنے

آئی ـــ چونکہ وہ انقلاب ایک پارٹی کی قیادت میں نہیں آیا تھا بلکہ وہاں انقلاب لانے میں بہت سی پارٹیوں نے متحدہ طور پر حصہ لیا تھا ۔ لہٰذا پھر آپس میں جو رسہ کشی ہوئی ہے وہ ڈھکی چھپی نہیں ـــ مجاہدینِ خلق کے ساتھ جو معاملہ ہوا ہے اور تحریک میں شامل دوسرے قائدین اور اراکین بلکہ خود اپنے قریب ترین ساتھیوں کے ساتھ مختلف نوعیت کے اختلافات کے باعث جو کچھ ہوا ہے اور جس طرح بیگانوں کے ساتھ بیگانوں کو بھی سینکڑوں نہیں ہزاروں کی تعداد میں موت کی گھاٹ اتار دیا گیا ہے، وہ بہت ہی بدنما اور بدترین داغ ہے ـــ اور چونکہ یہ داغ اسلامی انقلاب کے حوالے سے اسلام کے صاف و شفاف اور پاکیزہ دامن پر آتا ہے۔ اس لئے ہمیں اس سے برملا اعلانِ برأت کرنا ہوگا کہ اس کا کوئی تعلق اسلام کے ساتھ نہیں ۔

انقلابِ محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں کیا ہوا تھا! جب انقلاب کامیاب ہوا اور نبی اکرمؐ کا فاتحانہ مگر نہایت عجز و انکسار کے ساتھ مکہ مکرمہ میں داخلہ ہوا تو سردارانِ قریش جو آپؐ کے خون کے پیاسے تھے، جنہوں نے ذاتِ اقدسؐ اور آپؐ کے صحابہؓ کو جسمانی اور ذہنی ایذائیں پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اس وقت وہ سب خوف زدہ تھے۔ لرزہ براندام تھے کہ ان کے ساتھ کیا معاملہ ہوتا ہے! یہ لوگ حرم شریف میں اپنی قسمت کے منتظر تھے کہ رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میں تم سے وہی کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسف (علیہ السلام) نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا۔ لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ "آج تم پر کوئی گرفت نہیں" اِذْهَبُوا اَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ "جاؤ تم سب آزاد ہو" ـــ دربارِ محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے معافی اور امان پانے والے لوگوں میں وحشیؓ بھی شامل تھے (چونکہ ایمان لے آئے تھے اس لئے ان کا نام ادب سے لیا جائے گا) حضور صلی اللہ علیہ وسلم انسانی عواطف و جذبات سے خالی تو نہیں تھے۔ وحشی جان کے خوف سے چھپ گئے تھے چونکہ ان کے متعلق حکم تھا کہ جہاں بھی پائے جائیں قتل کر دیئے جائیں۔ جب وہ حضورؐ کی مجلس میں آئے تو حضورؐ نے رُخ پھیر لیا ۔ وہ دوسری طرف آگئے، آپؐ نے پھر رُخ پھیر لیا۔ تیسری طرف آئے تو آپؐ نے بیعت قبول فرمالی۔ پھر صحابہ کرامؓ سے فرمایا "جب میں نے دو مرتبہ اعراض کیا تھا تو تم میں سے کسی کو خیال کیوں نہ آیا کہ اس کی گردن مار دیتے چونکہ حضورؐ مکہ میں داخلے سے قبل یہ حکم دے چکے تھے جس کا

میں نے ابھی ذکر کیا۔ بیعتِ اسلام سے پہلے پہلے اگر یہ کام ہوجاتا تو ہو جاتا ۔ اب تو ان کو کلمہ کا تحفظ حاصل ہوگیا تھا ۔ یہ کون شخص تھا ؟ حضرت حمزہؓ کا قاتل اور ان کی لاش کا مُثلہ کر کے ان کا جگر نکال لینے والا شخص! لیکن جب وہ ایمان لے آتا ہے تو اسے بھی کلمے کا تحفظ حاصل ہو جاتا ہے ۔ کسی ایک شخص سے بھی حضورؐ نے ذاتی انتقام نہیں لیا ۔ وحشی تک کو معافی مل گئی تو اوروں کا کیا پوچھنا ۔ صرف وقتی طور پر دل میں ایک خیال پیدا ہوا تھا جس کے باعث حضورؐ نے ان کی بیعت قبول کرنے میں تردد سے کام لیا ۔ ان کی بیعت اسلام قبول فرمانے کے بعد بس اتنا فرمایا: کہ میرے سامنے آنے سے گریز کرنا چونکہ تم کو دیکھ کر مجھے حمزہؓ یاد آجائیں گے ۔ اس سے زائد کچھ نہیں ۔ وہ بھی وہیں رہے ۔ ان کو مسلمانوں کے تمام حقوق بھی حاصل ہوگئے ـــــ البتہ وہ فرمانِ نبویؐ کی تعمیل میں حضورؐ کے سامنے آنے سے گریز کرتے رہے ۔

ابو سفیانؓ بن حرب جو فتح مکّہ سے قبل نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے خلاف مشرکین مکّہ کے لشکروں کی قیادت کرتے رہے غزوۂ اُحُد میں مسلمانوں کو جو چرکہ لگا اس وقت بھی لشکرِ کفّار کے سپہ سالار یہی تھے ۔ لیکن اتنے بڑے دشمن کے گھر کو نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے مکّہ میں داخلے سے قبل ہی دارالامن قرار دے دیا تھا اور تو اور ان کی بیوی ہندہ بنت عتبہ جس کی شہ پہ وحشی نے چھپ کر حضرت حمزہؓ پر اپنے مخصوص نیزے کا کاری وار کیا تھا جس نے اپنے باپ کے جوشِ انتقام میں حضرت حمزہؓ (اسداللہ و اسد رسولہ) کے جگر کو چبانے کی کوشش کی تھی، اسے بھی نبی الرحمۃ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے دامن رافت و رحمت میں پناہ مل گئی ـــ ان کی بیعت قبول کرلی گئی ۔ دونوں شوہر و بیوی صحابہؓ کے حلقہ میں شامل ہوئے اور مخلص مومن ثابت ہوئے رضی اللہ عنہ وعنہا ۔ دونوں نے خلافتِ فاروقی میں جہاد میں حصہ لیا ۔ جنگ یرموک میں دونوں نے اسلام کے غلبے کے لئے شاندار کارنامے انجام دیئے ۔

یہ شان ہوتی ہے اسلامی انقلاب کی ۔ یہ اسوہ ہے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ـــ لیکن ایران کا معاملہ چونکہ انقلاب کی نوعیت کا نہیں تھا بلکہ Coup d'état تھا ۔ لہٰذا جو تنظیم مضبوط ترین تھی، جس کے ہاتھ میں اقتدار آگیا تھا اسے دوسرے ان حلیفوں کے ساتھ خون کی ہولی کھیلنی پڑی جن سے اندیشہ تھا کہ وہ حاصل شدہ اقتدار کے لئے کسی وقت بھی خطرہ بن سکتے ہیں ۔ جن میں خود اپنی تنظیم کے لوگ بھی شامل تھے ۔ چونکہ آپس میں چھینا جھپٹی کا امکان موجود تھا ۔ اخبارات میں شائع شدہ خبروں اور دیگر ذرائع سے حاصل شدہ معلومات کا ایک چوتھائی

حصّہ بھی صحیح تسلیم کیا جائے تو اندازہ لگائیے کہ سینکڑوں وہ لوگ بھی موت کے گھاٹ اتار دیے گئے جو تحریک کے فعّال کارکن تھے۔

لہٰذا میرے تجزیئے کا پہلا حاصل یہ سمجھئے کہ یہ درحقیقت انقلاب ہے ہی نہیں۔ اسے ہم فی الواقع ایک مذہبی طبقے کے ہاتھوں حکومت کا تختہ الٹنا (COUP BY CLERGY) کہہ سکتے ہیں۔ جبکہ پاکستان میں یہ کام فوج نے کیا ہے (گویا یہاں COUP BY ARMY تھا) اور وہاں جو مضبوط مذہبی حلقہ تھا اس نے اقتدار پر قبضہ کر لیا ـــــ غور کیجئے کہ عجیب مشابہت کا یہ سلسلہ اس کے بعد بھی چلا آ رہا ہے۔ ہمارے یہاں فوجی انقلاب کے نتیجے میں جس گروپ نے اس وقت اقتدار سنبھالا اس نے اسلام کے نفاذ کا بیڑا اٹھایا اور اس عزم کا اظہار کیا کہ وہ اس ملک میں نظریۂ پاکستان کے عین مطابق اسلامی نظام قائم اور نافذ کر کے ہی عام شہریوں (CIVILIAN) کو اقتدار منتقل کریں گے۔ اربابِ اقتدار کی طرف سے اس کے اقدامات بھی ہو رہے ہیں۔ ان کی نوعیت کیا ہے اور وہ مؤثر کیوں نہیں ہو رہے! یہ علیحدہ بحث ہے۔ بہرحال ظاہر میں تو حدود آرڈی ننس کا نفاذ ہے، نظام زکوٰۃ کا نفاذ ہے، شریعت کورٹس کا قیام ہے، اور اب اقامت صلوٰۃ کے نظام کا اجراء ہے۔ وہاں بھی چونکہ شاہ کے خلاف تحریک اسلام ہی کے نام پر کامیابی سے ہمکنار ہوئی لہٰذا وہاں بھی شریعت کی تنفیذ شروع ہوئی۔ البتہ اس میں بھی زمین و آسمان کا فرق ہے ـــ وہاں چونکہ اقتدار آیا ہے شیعہ علماء کے طبقہ کے ہاتھ میں، جو پہلے سے نہایت منظم تھا اور اپنے مسلک کے مطابق دینی شعار کا پابند تھا۔ لہٰذا وہ فوراً حرکت میں آئے اور انہوں نے اپنی فقہ کے نفاذ کا عمل تیزی سے شروع کر دیا۔ ان کو یہ ضرورت پیش نہیں آئی کہ پہلے وہ اسلامک آئیڈیالوجی کونسل بنائے جو ہر قانون کے متعلق اپنی سفارشات مرتب کرتی۔ پھر انہیں برسراقتدار گروپ کے سامنے پیش کیا جاتا اس طرح معاملات غیر ضروری تاخیر و تعویق کی نذر ہو جاتے جیسا کہ ہمارے یہاں ہو رہے ہیں۔ فقہ جعفری مدوّن شکل میں موجود تھی لہٰذا اس کا نفاذ فوراً شروع ہو گیا۔ کوئی دشواری آئی بھی تو انقلابِ ایرانی کے قائدین اجتہاد سے کام لے کر اسے حل کر دیتے ہیں۔ لہٰذا ان کے ہاں فقہ کی تنفیذ کا عمل تیز اور واضح ہے ـــ ہمارے یہاں ہر معاملہ ڈانواں ڈول ہے۔ اس لئے کہ یہاں جن لوگوں کے ہاتھوں میں اقتدار آیا ہے وہ علماء کے طبقے سے نہیں ہیں۔ نماز روزہ کی پابندی صدر مملکت صاحب کی حد تک تو معلوم و معروف ہے دیگر جرنیلوں کا کیا حال ہے! واللہ اعلم ـــــ پھر یہ کہ داڑھی جو شعائرِ اسلام

میں شامل ہے صدر صاحب کے چہرے پر بھی نہیں ہے شاید وہ اپنے اندر اس کی ہمت نہیں پاتے۔ گھر میں پردہ نہیں۔ اس کو وہ اپنے گھر تک ہی نافذ کر دیں یہ ان کے لئے مشکل ہے جبکہ ایران میں علماء کے طبقے میں یہ تمام پابندیاں اور یہ شعائر پہلے سے موجود تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں فوجی حکومت کے ذریعے نفاذ اسلام (ISLAMISATION) کی جو کوشش کی جارہی ہے۔ اس کا حال بھی قریباً ویسا ہی ہے جیسا تحریک نظام مصطفیٰ کا تھا کہ اس میں بھانت بھانت کے نظریات رکھنے والے افراد بھی شامل تھے اور پارٹیاں بھی۔ یہی حال قریباً ارباب اقتدار میں سے اکثر کا ہے ـــــ لیکن ایران میں مذہبی طبقے (COUP BY CLERGY) کے ذریعے جو نفاذ اسلام کا کام ہوا ہے وہ زوردار ہے۔ بہرحال انہوں نے بڑی قوت اور اعتماد کے ساتھ ان کو نافذ کیا ہے اس اعتبار سے ان دونوں کے درمیان فرق ہے لیکن نوعیت ایک ہے۔ ہمارے یہاں فوجی حکومت نے اقتدار پر قبضہ کیا (یعنی COUP BY ARMY) اور وہاں علماء نے حکومت پر قبضہ کر لیا۔

ایرانی طرز کا انقلاب پاکستان میں ممکن نہیں

اب میں آپ کے سامنے اس سلسلے کی آخری بحث رکھنا چاہتا ہوں ـــــ وہ یہ ہے کہ ایران والی صورت حال پاکستان میں کبھی نہیں آسکتی۔ بالفاظِ دیگر یہ Coup by Clergy پاکستان میں ممکن نہیں ہے۔ یہاں آئے گا تو خالص محمدیؐ انقلاب آئے گا صلی اللہ علیہ وسلم۔ یہ درمیان کی چیز یہاں ممکن نہیں ہے ـــــ کیوں ممکن نہیں ہے؟ اس کی چند وجوہات ہیں۔ ان کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ اور ذہن نشین کر لیں۔

پہلا فرق : ہمارے اور ان کے حالات میں ایک بہت بڑا فرق یہ ہے کہ اصل میں مسلمانوں میں فرقہ وارانہ تقسیم صرف ایک ہی ہے اور وہ بڑی بنیادی تقسیم ہے۔ اور وہ ہے شیعہ سُنّی کی تقسیم! میں ان شاء اللہ اس بنیادی تقسیم کے فرق کو تفصیل کے ساتھ اگلے جمعہ کو بیان کروں گا۔ ـــــ باقی کوئی بنیادی تقسیم ہمارے یہاں موجود نہیں ہے۔ لفظ 'فرقہ' کا اصل اطلاق شیعہ سُنّی پر ہی ہوتا ہے۔ رہا اہل سنّت کا معاملہ تو حنفی ہوں، مالکی ہوں، شافعی ہوں، حنبلی ہوں، اہلحدیث ہوں، سلفی یا ظاہری ہوں یہ سب کے سب اہل سنّت ہی کے مختلف مکاتب فقہ ہیں۔ ان میں مسالک کا اختلاف تو ہے لیکن کوئی اختلاف دین کی بنیادی نوعیت کی چیزوں کے بارے میں نہیں ہے۔ تفریق کر دینے والی، پھاڑ دینے والی اور بنیادی اختلافی چیز شیعیت و سنّیت ہی ہے۔ البتہ شیعوں

میں بے شمار فرقے ہیں۔ ان میں اثنا عشری ہیں شش امامی ہیں، زیدی ہیں، اسماعیلی ہیں، نُصیری ہیں، دروزی ہیں، غرابی ہیں، اور نہ معلوم کتنے مزید فرقے ہیں۔ جن کے مابین بڑے بنیادی اختلافات ہیں۔ اب اہل سنت اور اہل تشیع کے اعتبار سے ہمارے یہاں پاکستان میں جو تقسیم ہے وہ اس سے بہت مختلف ہے جو وہاں ایران میں ہے۔ وہاں اکثریت شیعوں کی ہے اور وہ بھی قریباً صد فی صد اثنا عشری شیعہ۔ لیکن اس سے بھی آگے بڑھ کر مسئلہ یہ ہے کہ وہاں جو تقسیم ہے وہ علاقائی ہے۔ جو اصل ملک ایران ہے، ایران کا قلب (یعنی MAIN LAND OF IRAN) وہاں صد فی صد شیعہ آباد ہیں۔ وہاں سنّیوں کا وجود ہی نہیں ہے ــــ سنّی صرف سرحدی علاقوں میں ہیں اور منتشر ہیں۔ مثال کے طور پر جنوب مشرق میں بلوچ قبائل ہیں جو سُنّی ہیں۔ اسی طرح شمال مشرق میں بالکل مخالف سمت میں کرد قبائل اور کچھ افغان قبائل ہیں جو سُنّی ہیں۔ اس کے علاوہ اہواز کا صوبہ جو خلیج سے متصل علاقہ ہے، جہاں تیل کی دولت بھی کافی ہے، اس میں کچھ عرب سُنّی قبائل آباد ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ سعودی عرب کے جس علاقے میں تیل کی کافی نکاس ہے اس میں بھی شیعہ عرب قبائل آباد ہیں اور ان کی خاصی تعداد ہے لیکن ایران میں صرف چار کونوں میں سُنّی آباد ہیں۔ وہاں ان کی کثرت ہے لیکن قطعی غیر مؤثر۔ اصل ملک ایران میں یعنی قلب ایران میں سرے سے سُنّیوں کا وجود ہی نہیں وہاں صد فی صد شیعہ آباد ہیں ــــ جبکہ ہمارے یہاں تو شیعہ سُنّی گڈمڈ ہیں۔ آبادیاں ملی جلی ہیں۔ کچھ دور دراز کے کوہستانی علاقے جیسے چترال اور ہنزہ وغیرہ میں شیعہ خاص طور پر آغاخانی شیعوں کی کثرت ہے۔ یا بلتستان میں شیعہ اور سُنّیوں کے بین بین ایک فرقہ نوربخشی ہے۔ ان کو ملا کر وہاں شیعہ حضرات کی اکثریت ہو جاتی ہے۔ باقی تو عموماً یہی ہے کہ داہنے سُنّی آباد ہیں تو بائیں کچھ شیعہ بھی آباد ہیں۔ اور بڑے شہروں میں جہاں فلیٹ لائف ہے ان میں اوپر شیعہ تو نیچے سُنّی یا عکسی کیفیت ہے۔ اس اعتبار سے ہمارے ہاں اس مذہبی اختلاف کی جو صورت بالفعل ہے وہ ایران کے مقابلے میں بہت مختلف ہے۔ وہاں کے انقلابی طریق کار ــــ (METHODOLOGY) کو جوں کا توں لا کر یہاں نافذ کرنے کے متعلق اگر کچھ لوگ سوچتے ہیں تو میرے خیال میں وہ جنت الحمقاء میں بستے ہیں انہیں یا تو حقائق کا علم نہیں یا وہ دانستہ حقائق سے صرف نظر کئے ہوئے ہیں۔

دوسرا فرق: دوسرا بنیادی فرق کیا ہے؟ یہ ایران میں بعض اسباب سے شیعہ علماء

کی تنظیم بہت ہی منظّم ہے۔ وہاں ان کا ایک باعزّت مقام ہے اور بہت محکم نظام ہے۔ جیسے عیسائیوں میں پوپ، اس کے بعد کارڈینل اور اس کے بعد بتدریج مختلف عہدے اور مرتبے ہیں۔ ضلع کمشنری اور صوبے میں بھی ان کے عہدیدار ہوتے ہیں اور یہ تقسیم تحصیل کے درجے تک آجاتی ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جس طریقے سے عیسائیت میں بہت ہی منظّم درجہ بندی ہے اسی طرح اہلِ تشیع کے یہاں بھی نہایت منظّم اور اعلیٰ نوعیت کی درجہ بندی ہے پھر یہ کہ مذہبی تعلیم کا نظام بھی اسی طرح بہت اعلیٰ اور معیاری ہے جس طور پر عیسائیوں کے ہاں مذہبی تعلیم کا معیار بہت بلند ہے ـــــ ہندوستان سے زکوٰۃ اور عشر و خمس اکثر و بیشتر ایران جاتا تھا اور شاید اب بھی جاتا ہو۔ ان کے وسائل و ذرائع اتنے وسیع ہیں کہ ان کے پاس پیسے کی کوئی کمی نہیں ہے۔ ان کے بڑے بڑے اوقاف ہیں جو کافی منظّم ہیں۔ تمام آمدنی ایک مرکزی جگہ اکٹھی ہوتی ہے۔ اور ان کی یافت سے ایک اعلیٰ نظم کے ساتھ تمام شیعہ مدارس اور دارالعلوموں کو حصّہ رسد بہم پہنچایا جاتا ہے۔

تیسرا فرق: تیسری بات یہ ہے کہ ایران ہماری طرح کبھی بھی براہِ راست کسی بیرونی ملک کا سیاسی غلام نہیں رہا۔ ہم تو بدقسمتی سے دو سو برس بالواسطہ انگریز کے غلام رہے ـــ اور نوّے سال تو بالکلیہ طور پر یہ غلامی ہم پر مسلّط رہی ہے۔ اس غلامی کے دوران انگریز نے ہمارے تمام دینی ادارے (INSTITUTIONS) تباہ و برباد اور منتشر کر کے رکھ دیئے ـــ ہمارے ایرانی بھائی کبھی بھی ہماری طرح براہِ راست کسی کے غلام نہیں رہے۔ غلامی کا جو دور بھی وہاں رہا ہے وہ بالواسطہ (Indirect) غلامی کا دور تھا۔ ان کا اندرونی نظام قائم و محفوظ رہا۔ یعنی داخلی طور پر انہیں خود مختاری حاصل تھی لیکن بالاتر اقتدار انگریز کے ہاتھ میں تھا۔ ہمارے یہاں بھی تقریباً یہی صورتِ حال ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی تک رہی یعنی ملک کی حقیقی حکومت تو کمپنی بہادر کے ہاتھ میں تھی لیکن داخلی طور پر ایک علامتی بادشاہ بھی موجود تھا اور شرعی عدالتیں بھی قائم تھیں جہاں عموماً رائج الوقت قانون یعنی فتاویٰ عالمگیری کے مطابق فیصلے ہوتے تھے۔ لیکن ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک ہماری براہِ راست غلامی کا دور رہا ہے کہ ملکی قانون (Laws of the Land) پورا کا پورا انگریز کا نافذ ہو گیا۔ ہماری عدالتیں ختم ہو گئیں۔ قاضی برطرف ہو گئے۔ تعزیراتِ ہند نئے سرے سے مدوّن ہو کر عدالتوں میں نافذ ہو گئیں۔ تمام اہم سول

عہدوں پر انگریز تعینات ہو گئے۔ عدالتی اور سرکاری زبان انگریزی قرار دی گئی اور اس طرح ہماری تہذیبی اور معاشرتی اقدار میں بھی انگریزی تہذیب و تمدّن کا نفوذ شروع ہو گیا۔ حتیٰ کہ آزادی کے بعد بھی اس تہذیب کا استیلاء نہ صرف برقرار ہے بلکہ روز افزوں ہے ـــــ اس کے برعکس ایران چونکہ براہِ راست انگریز کی غلامی سے محفوظ رہا لہٰذا وہاں کا داخلی نظام بھی برقرار رہا ـــ فارسی زبان اپنی جگہ رہی اور ان کے تمام مذہبی ادارے بھی انگریز کی بالادستی اور حکومت کی دست بُرد سے بالکل محفوظ رہے۔ لہٰذا اس معاملہ میں وہ یقیناً ہم سے بہت آگے رہے بلکہ ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہی وجہ ہے کہ ان کے لئے ممکن ہو سکا کہ وہ حالیہ تحریک کی کامیابی کے بعد اپنا مذہبی نظام حکومتی سطح پر فوری طور پر نافذ کرنے میں کامیاب ہو گئے ـــــ مختصراً یہ کہ ایک طرف شیعہ آبادی کی اکثریت کہ اصل ملک کے اعتبار سے ایران صد فیصد شیعہ ملک ہے سُنّی صرف سرحدی علاقوں میں آباد ہیں۔ دوسری طرف ان کے یہاں شیعہ علماء کے ایک منظّم و فعّال ادارہ کا عرصے سے موجود ہونا۔ پھر اس کی درجہ بندی، اُس کی تعلیم کا بہت اعلیٰ اور عمدہ نظام پھر اس کے اپنے مستقل اور مستحکم مالی وسائل و ذرائع ـــــ یہ چند اسباب تھے جن کے باعث شیعہ علماء کا ادارہ اتنا منظم تھا کہ اس نے Take Over کر لیا۔

لہٰذا ایران میں تو ممکن تھا کہ مذہبی طبقہ برسر اقتدار آجاتا، ہمارے یہاں یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات ہی سرے سے خارج از بحث ہے ـــــ ہمارے یہاں تو سُنّی اسلام کی پاکستان گیر سپانے پر کوئی ایک تنظیم موجود ہی نہیں ہے۔ اہل سنّت یہاں تین بڑے حصّوں میں منقسم ہیں۔ ایک حنفی مسلک ہے۔ ان میں دو تقسیمیں ہیں۔ ایک دیوبندی اور ایک بریلوی۔ ایک فقہ کے ماننے کے باوجود ان میں بُعد المشرقین واقع ہو چکا ہے۔ تیسرے سلفی المسلک ہیں جو یہاں اہل حدیث کہلاتے ہیں۔ ان تینوں کے اپنے علیحدہ علیحدہ نظام ہیں۔ پھر انتشار اور پراگندگی کا حال یہ ہے کہ سب میں ذیلی تقسیمیں موجود ہیں ـــ سیاسی اعتبار سے دیوبندیوں کے نہ معلوم کتنے گروپ ہیں۔ کتنی جمعیتیں ہیں۔ کون سی حقیقی جمعیت علماء اسلام ہے اور کون سی غیر حقیقی! پتہ ہی نہیں چلتا۔ آج جو گروپ زیادہ معروف ہیں ان کی صورت حال یہ ہے کہ ان میں سے ایک حکومت کے ساتھ ہے، ایک ایم آر ڈی کے ساتھ اور تیسرا بین بین ہے۔ کچھ یہی حال اہل حدیث حضرات کی جمعیتوں کا ہے اور کم و بیش

یہی صورت حال بریلوی مکتب فکر کی جمعیتوں کی نظر آتی ہے۔ پس ہمارے ملک میں علماء کی کوئی تنظیم ایسی نہیں ہے جو ملک گیر ہو۔ نہ کوئی ایسی دینی شخصیت ہے کہ جو ہر مکتبہ فکر کے علماء کے نزدیک مقتدر اور معتمد علیہ ہو۔ جس کو تمام علماء اپنا قائد تسلیم کرلیں۔ جیسا کہ ساٹھ ستر سال قبل یہ مقام حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کو حاصل تھا کہ اس دور میں صرف ایک ہی جمعیت العلماء ہند تھی اور اہل سنّت کے تمام مکاتب فکر اور تمام فقہی مسالک کے علماء اس کے پلیٹ فارم پر جمع تھے۔ یہ معاملہ ہمارے یہاں بالکل نہیں ہے۔ بلکہ شدید انتشار اور تشتت ہے۔

پھر ہمارے یہاں دینی تعلیم کا جو نظام ہے اس میں کوئی درجہ بندی (Gradation) نہیں ہے۔ چند دیوبندی اور تھانوی مدارس نے اپنا اپنا وفاق المدارس قائم کرکے کچھ درجہ بندی کی کوشش کی ہے باقی تو یہاں کھلی چھوٹ ہے۔ چار پانچ بچّوں کو ناظرہ قرآن پڑھانے کے لئے ایک حجرہ حاصل کرکے جو چاہے اس پر جامع تعلیم القرآن کا بورڈ لگا سکتا ہے۔ جبکہ جامعہ کہتے ہیں یونیورسٹی کو۔ کوئی نہیں پوچھے گا کہ حضرت اسے "جامعہ" کس اعتبار سے کہا جارہا ہے! ہمارے ہاں معیاری دینی درس گاہیں بھی یقیناً ہیں لیکن بے شمار ایسے دینی ادارے بھی موجود ہیں جہاں تعلیم کا کوئی معیار نہیں لیکن وہاں سے بھی دھڑا دھڑ سندیں جاری ہوتی ہیں اور کوئی ایسا مرکزی نظام موجود نہیں ہے جو تحقیق کرے کہ سند جاری کرنے والا ادارہ کس معیار کا ہے اور اس نے کس استحقاق پر یہ سندیں جاری کی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ دینی مدارس کا معیارِ تعلیم بہت نیچے جا چکا ہے۔ اس ضمن میں ایک صاحب نے جو نیوی میں اچھے عہدے پر ہیں، مجھ سے اپنا نہایت تلخ تجربہ بیان کیا۔ وہ صاحب پاکستان نیوی میں دینی تعلیم کے لئے کچھ علماء کے تقرر کے سلسلے میں لاہور تشریف لائے تھے۔ مجھ سے بھی ملے۔ وہ خود بھی اچھے دینی ذوق کے حامل ہیں۔ انہوں نے بہت دکھ کے ساتھ بتایا کہ انٹرویو دینے کے لئے بہت سے حضرات بڑی مرصع و مسجع سندوں کے ساتھ تشریف لائے تھے۔ لیکن دورانِ انٹرویو جب ان سے 'صحاح ستہ' کی تفصیل پوچھی گئی تو ان میں ایسے بھی تھے جو 'صحاح ستہ' نام کی کسی شے سے واقف نہ تھے۔ اور جن کے لئے یہ ترکیب ناآشنا نہیں تھی وہ بھی جواب میں صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے سوا حدیث کی تیسری کسی کتاب کا نام نہ لے سکے بلکہ ایک صاحب نے تیسری کتاب کے طور پر نام لیا بھی تو 'موطا' کا۔ ع ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے!

—— حال ہی میں مجھے اپنے دعوتی و تبلیغی کام کے سلسلے میں آزاد کشمیر کے بعض اہم شہروں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں مجھے بتایا گیا کہ انگلستان میں امامت کے لئے مولویوں کی بہت ڈیمانڈ ہے۔ اور انگلینڈ میں آباد پاکستانیوں میں سے ایک کثیر تعداد چونکہ ان لوگوں پر مشتمل ہے جن کا تعلق آزاد کشمیر سے ہے اس لئے فطری طور پر زیادہ تعداد میں مولوی حضرات اسی علاقے سے بلائے جا رہے ہیں۔ مجھے آزاد کشمیر میں متعلقہ دفتر کے ایک ذمہ دار شخص نے بتایا کہ بطور امام مسجد انگلینڈ جانے کے خواہش مند حضرات جب پاسپورٹ یا ویزا لینے کے لئے آتے ہیں تو ان میں سے اکثر جلدی جلدی چند سورتیں رٹ رہے ہوتے ہیں تاکہ اگر کوئی پوچھے کہ کتنی سورتیں حفظ ہیں تو ہم کچھ سورتوں کا نام بتا سکیں اور انہیں سنا سکیں —— تو اس معیار کے لوگ انگلستان جا کر امام بن رہے ہیں۔ نتیجہ کیا ہے کہ وہاں وہ ہنگامہ ہے کہ اللہ حفظ و اماں میں رکھے۔ مسجدوں میں خوں ریزیاں ہوتی ہیں۔ مساجد میں پولیس بوٹوں اور کتوں سمیت داخل ہوتی ہے۔ کئی مساجد انہی فسادات کے باعث بند کر دی گئی ہیں اور یہ سب کچھ اس وجہ سے ہوا ہے کہ وہاں ان لوگوں نے مساجد سنبھالی ہیں جن کی کوئی تعلیم نہیں۔ ان سے کوئی پوچھنے والا نہیں کہ آپ نے کیا پڑھا ہے! کہاں پڑھا ہے! اور اگر کہیں پڑھا ہے تو وہ کس معیار کا مدرسہ یا دار العلوم ہے: کوئی لاء کالج یا ہماری یونیورسٹی کی سند لے کر جاتا ہے تو اس کی توثیق ہو جاتی ہے چونکہ یہ معروف اور مستند ادارے ہیں۔ لیکن دینی تعلیم کی اتنی بے وقعتی ہے کہ اسناد کی توثیق کا اور تحقیق کا کوئی مرکزی نظام ہمارے یہاں سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔

یہ وہ چند اہم اسباب ہیں جن کی بنیاد پر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ وہ حالات جن کے نتیجے میں ایران میں علماء نے حکومت پر قبضہ کیا وہ حالات یہاں بالکل نہیں ہیں —— چنانچہ اس طرح کا انقلاب بلکہ صحیح تر الفاظ میں کوئی تبدیلی پاکستان میں لانا قطعی ناممکن ہے۔ البتہ جب بھی اللہ کو منظور ہوگا تو یہاں انقلاب اسی نہج سے آئے گا جو نہج ہمیں سیرتِ محمدی میں نظر آتا ہے۔ گویا یہاں اگر آئے گا تو خالص محمدی انقلاب آئے گا۔ اس کے اصول و مبادی پر گفتگو ان شاء اللہ آئندہ کسی موقع پر ہوگی۔

ابھی تو اس موضوع کی بھی دوسری نشست باقی ہے کہ دینی اور مذہبی اعتبار سے سُنّی اور شیعہ اسلام میں اصل فرق و تفاوت اور اختلاف کی نوعیت کیا ہے! جو انقلاب

(بقیہ صفحہ ۶۸ پر)

عَن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ عَن النبی صلی اللہ علیہ وسلم

قَالَ

لَا یُؤمِنُ اَحَدُکُم

حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیہِ مَا یُحِبُّ لِنَفسِہٖ

(رواہ البخاری)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا، تم میں سے ایک شخص اس وقت تک (کامل) مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے وہ چیز پسند نہ کرے جسے وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

رشید جیولری ہاؤس لاہور

ٹمپل روڈ — سوہا بازار

۳۱۱۴۴۰ — ۳۰۴۳۳۳ — ۶۴۴۳۳ — ۵۶۴۷۹

پروپرائیٹر: اے وحید

اخلاق حسین قاسمی دہلوی
مہتمم جامعہ رحیمیہ

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی اپیل اور علمائے دیوبند

ہندوستان میں دعوت قرآنی کی بنیاد حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ڈالی۔ اور ان کے صاحبزادگان نے اسے پروان چڑھایا،

قرآن کریم نے اس دعوت کو جہاد کبیر قرار دیا ہے۔

وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ۝

قرآن کریم جس فطری اور وجدانی اسلوب میں اسلام کی دعوت دیتا ہے وہ بقول شاہ ولی اللہ انسان کی فطرت سلیم کو اپیل کرتی ہے اور عقل سلیم کی پیاس بجھاتی ہے۔

شاہ ولی اللہ کے بعد شاہ صاحب کی جماعت نے اس دعوت کے سلسلہ کو جاری رکھا۔

مولانا عبیداللہ سندھی نے دعوت قرآنی کو جاری رکھنے کے لیے باقاعدہ تنظیم بنائی، مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی جادو بھری تحریر و تقریر سے دعوت بالقرآن کو رواج دیا۔

مولانا احمد سعید صاحب دہلوی اور مولانا احمد علی صاحب لاہوری نے قرآن کریم کی تعلیمات اور اس کے پیغام کی ترویج و اشاعت کو اپنی تبلیغی اور واعظانہ سرگرمیوں میں پوری اہمیت دی۔ کیونکہ اس جماعت کے شیخ مولانا محمود الحسن صاحب شیخ الہند نے مالٹا کی اسارت سے واپس آکر اپنی جماعت کو براہ راست قرآن کریم سے وابستہ ہونے کی ہدایت فرمائی تھی اور امام شاہ ولی اللہؒ کے خصوصی مشن کو آگے بڑھانے کی طرف متوجہ کیا تھا۔

علماء دیوبند کے فیض یافتہ عالم

مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے بھی اقامت دین کی خاص جدوجہد میں قرآن کریم

کو اہمیت دی۔

قرآنِ کریم کی دعوت ایک اصولی دعوت ہے اور اس دعوت کی اہمیت یہ ہے کہ امت کے تمام فرقے ہر قسم کے فقہی اور اعتقادی اختلافات کے باوجود اس مشن پر متحد ہو کر اور کندھے سے کندھا ملا کر جدوجہد کر سکتے ہیں۔

دعوت قرآنی کی تحریک کو چلانے والے قائدین اور کارکنوں کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ اس اصولی دعوت کے اہم تقاضوں کو مدنظر رکھیں اور خاص طور پر اس تقاضے کو پورا کریں کہ اعتقادی اور فقہی جزوی اختلافات کی بحث کو اس تحریک کے دائرہ میں داخل نہ ہونے دیں۔

شاہ ولی اللہؒ کے ہاں فقہی اختلافات میں جو توسع نظر آتا ہے اور جس توسع پر خاص کر حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ نے زور دیا ہے اس کا مقصد یہی ہے۔

شاہ ولی اللہؒ سے پہلے حضرت مجدد صاحب رہ کی تحریک ترویج سنت اور تردید بدعات کے اندر بھی فقہی اختلافات میں یہی وسعت فکر و نظر ملتا ہے۔

حضرت مجدد صاحب ایک مکتوب میں فرماتے ہیں۔

"باوجود التزام ایں مذہب مرا با امام شافعیؒ گو یا محبت ذاتی است و بزرگ مے دانم لہذا در بعض اعمال نافلہ تقلید مذہب او مے نمایم"، (مکتوب ۵۵ دفتر دوم ص۱۱)

باوجود اس کے کہ میں حنفی مسلک کی پابندی کرتا ہوں مجھے امام شافعیؒ سے ذاتی محبت ہے اور میں انہیں بزرگ مانتا ہوں اور اسی لیے بعض عبادات میں ان کے مسلک کی پیروی کرتا ہوں۔

صاحب اتحاف نے لکھا ہے کہ شیخ عبدالحق صاحب محدث دہلوی اور حضرت مجدد صاحب کے درمیان اختلافات کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ محدث صاحب کو فقہی مذہب میں بے حد تشدد تھا اور مجدد صاحب مطلق اتباع سنت اور بدعات کی تردید پر زور دیتے تھے (ص۱۶۲)

پاکستان اہل علم میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے دینِ برحق کے غلبہ اور اقامت کے لیے قرآن کریم کی اصولی دعوت کا مشن اختیار کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کو نہ عالم ہونے کا دعویٰ ہے اور نہ فقیہ و متکلم اور شیخ طریقت ہونے کا ادعا ہے۔

خدا تعالیٰ نے موصوف کو اپنے مقدس کلام کا بڑا اچھا فہم عطا فرمایا ہے اور اس کلام عظیم کے اصولی پیغام کو جدید استدلالی اسلوب میں پیش کرنے کی صلاحیت سے نوازا ہے

ڈاکٹر صاحب جدید تعلیم یافتہ آدمی ہیں اور موصوف نے قرآن کریم کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور وہ اس تحریک میں اپنا تن من دھن سب کچھ لگا چکے ہیں

ڈاکٹر صاحب کے سامنے اقامت دین کی تحریک کے تمام دور موجود ہیں اور جماعت اسلامی کی تحریک میں شامل رہ کر تمام اتار چڑھاؤ سے موصوف آگاہ ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے دعوت قرآنی اور اقامت حق کی دعوت سے فقہی اختلافات کو دور رکھا ہے وہ اہل علم کو فقہی اور اجتہادی مسائل میں وسعت فکر و نظر کی دعوت ضرور دیتے ہیں۔ معتدل راستہ اختیار کرنے کی اپیل کرتے ہیں جو آج کے حالات کا شدید تقاضا ہے۔ لیکن عوام کو وہ یہی مشورہ دیتے ہیں کہ اتباع سنت کی نیت سے ان کے لیے عافیت اسی میں ہے کہ وہ ایک فقہ کی پیروی کریں (میثاق نومبر ۷۴ء)

لیکن ایک تقریر میں ڈاکٹر صاحب نے ضمناً اجتہادی اور فقہی بحث میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی کا مظاہرہ کیا اور اپنے فقہی مسلک کے بارے میں اپنے لیے نیم مقلد کی تعبیر اختیار کی اور مستقبل کے لیے یہ آرزو کی کہ فقہی اختلافات میں اتحاد عمل کی کوئی سبیل نکل آئے۔

میرے خیال میں ڈاکٹر صاحب سے سہواً ہوا۔ موصوف جس احتیاط کے ساتھ کام کر رہے ہیں وہ احتیاط اس تقریر میں قائم نہ رہ سکی۔

موصوف کو اچھی طرح معلوم ہے اور ذاتی طور پر تجربہ ہے کہ مولانا مودودی صاحب نے تحریک اقامت دین کے امیر و قائد کی حیثیت سے فقہی مسائل میں ادھر اُدھر ہاتھ مار کر تحریک کو نقصان پہنچایا۔

وہ یقیناً صاحب علم آدمی تھے فقہی مسائل میں بھی اچھی بصیرت کے حامل تھے مگر ایک

اصولی اور بنیادی تحریک کے داعی کے لیے فقہی مسائل کے اختلافات میں پڑنا اور ہر مسئلہ میں اپنی منفرد راہ دکھانا کسی طرح مناسب نہیں تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے اس نزاعی خطاب میں تفصیلی طور پر نہ سہی اجمالی طور پر جس آرزو کا اظہار کیا ہے، اس سے بعض علماء کو شکایت پیدا ہوئی۔

ڈاکٹر صاحب موصوف نے میثاق نومبر کے پرچہ میں اس غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے وہ علماء حق کو مطمئن کرنے کے لیے کافی ہے۔

مجھے امید ہے کہ تقلید اور نیم تقلید جیسے جزوی مسائل کو دعوت قرآنی کے بنیادی مشن کے مقابلہ میں اہمیت نہیں دی جائے گی۔

پاکستان کے اندر اس وقت جزوی مسائل میں مختلف مکاتب فکر کے علماء جس طرح آپس میں گتھم گتھا ہیں اور مخالف شریعت عناصر اس کو ہوا دے کر علماء دین کا مذاق اڑا رہے ہیں اور اس حربہ عقائد سے وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ملک میں شرعی نظام قائم کرنے کا مطلب اس لڑاکو طبقہ کے ہاتھ میں ملک کی باگ ڈور دینا ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے فقہی موقف کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ موصوف کا مقصد یہی ہے کہ جزوی اور فروعی اختلافات کی شدت اور ہنگامہ آرائی کم سے کم ہو جائے ـــــ اور ملت کی پوری طاقت و توجہ دین برحق کی اصولی دعوت پر مرکوز ہو جائے۔

البتہ اس بحث کے ساتھ ڈاکٹر صاحب نے ایک دوسرے بڑے جھگڑے کو چھیڑ دیا ہے اور امامت اور امارت کا مسئلہ کھڑا کر دیا ہے۔

اور ساتھ ہی اس کا جوڑ مولانا ابوالکلام آزادؒ کی امامت کے بارے میں حضرت شیخ الہندؒ کی تجویز سے لگا دیا ہے گویا ڈاکٹر صاحب نے بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیا ہے۔

اس بحث کو چھیڑتے ہوئے ڈاکٹر صاحب جذبات میں آ گئے اور موصوف کو اتنا خیال نہ رہا کہ جس ہستی (مولانا آزادؒ) کی امامت کے مسئلہ کو وہ سند کے طور پر علماء دیوبند کے سامنے پیش کر رہے ہیں اس دانش مند ہستی نے امامت کی تجویز کو حالات کے پیش نظر کس طرح لپیٹ

کر رکھ دیا اور ساری زندگی مولانا مرحوم اسے زبان و قلم پر نہ لائے۔

املت کی تجویز کی مخالفت گھر میں ہوئی ان رفقاء کی طرف سے ہوئی جو مولانا آزاد کی رفاقت میں کام کر رہے ہیں۔ مگر مولانا نے حالات کے نیور دیکھ کر ہمیشہ کے لیے خاموشی اختیار کر لی اور کبھی کوئی شکوہ و شکایت زبان پر نہیں لائے۔

مسلم جماعتوں کے تبصرہ میں ڈاکٹر صاحب نے غصہ سے کام لیا ہے تحمل سے کام نہیں لیا موصوف کے نزدیک حضرت شیخ الہند اپنے دور کے مجدد تھے، شیخ الہند نے اپنے بعد اپنے شاگردوں کی ایسی جماعت چھوڑی جو علم و فضل اور تقوی و جہاد میں نابغہ روزگار تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کے خیال میں شیخ الہند کے شاگردوں نے سیکولر جماعتوں کا ضمیمہ بن کر آزادیٔ ہند کی لڑائی میں حصہ لیا۔

حالانکہ تاریخ کا ایماندارانہ مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ مشترک جدوجہد کا منصوبہ شیخ الہند اسارت مالٹا سے اپنے ساتھ لائے تھے۔

ترکی قائدین نے شیخ کو یہ مشورہ دیا کہ ہندوستانی مسلمان تنہا جدوجہد کر کے انگریزوں کو ہندوستان سے نہیں نکال سکتے ـــــ جیسا کہ اب تک وہ ناکام رہے ہیں۔

اسی تجویز کے مطابق شیخ الہندؒ کے مایہ ناز شاگرد مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ، مفتی محمد کفایت اللہؒ، مولانا ابوالمحسن سجاد بہاریؒ، مولانا احمد علی لاہوریؒ نے جمعیۃ علماء ہند کے پلیٹ فارم سے آزادی کی جنگ میں قائدانہ طور پر حصہ لیا ـــــ تابعانہ اور ضمیمہ بن کر حصہ لینا ان حضرات کی خودداری اور علم و فضل کی توہین تھا مکمل آزادی کی تجویز سب سے پہلے جمعیۃ علماء ہند نے منظور کی۔ آزادی کی تحریکات میں ہر قسم کی قربانیوں کا حصہ اپنی تعداد کے لحاظ سے مسلمانوں کا زیادہ نکلتا ہے۔

مشترک جدوجہد کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں ملت اسلامیہ کے تشخص کی حفاظت کے محاذ پر جماعت شیخ الہند نے بھرپور جدوجہد جاری رکھی۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ نے سن ۴۵ کے اجلاس جمعیۃ علماء ہند منعقدہ لاہور کے خطبہ میں صاف صاف اعلان کیا کہ مشترک جدوجہد

سے حاصل ہونے والی آزادی اور جمہوری حکومت ہماری آخری منزل نہیں بلکہ اس آزادی سے آخری منزل (اسلامی نظامِ حیات کا قیام) ہمارے لیے آسان ہو جائے گی

اس خطبہ میں مولانا مدنی نے اسلامی نظام حیات کے بنیادی اصولوں کی مکمل وضاحت فرمائی۔

یہ دور جدوجہد آزادی کے شباب کا دور تھا اور شیخ الہند کی جماعت لگی لپٹی اور گول مول بات کہنے کے بجائے اپنا مدعیٰ صاف صاف پیش کر رہی تھی۔

جماعت شیخ الہند نے اسی دور میں مخالف اسلام تحریکوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ انگریز حکومت کے کارندوں نے جماعت شیخ الہند کو بدنام کرنے میں کوئی کسر نہ کی۔ سیاسی اتحاد کو مغربی تصور کے مطابق نیشنل ازم کے مترادف قرار دیا گیا۔ اور متحدہ قومیت کے لفظ سے فائدہ اٹھایا گیا۔۔۔ لیکن بہت جلد دنیا نے دیکھا کہ آزادی کے بعد مصائب و مشکلات میں گھری ہوئی ملت اسلامیہ ہند کے ملی اور ثقافتی تحفظ کی جدوجہد میں جماعت شیخ الہند مصروف جہاد ہے جبکہ بڑے بڑے بہادر قائدین اور اسلام پسند ہنمایان کرام ہجرت کے نام پر ہندوستان چھوڑ چکے تھے۔

تقسیم ہند کے بعد اصل نصب العین کے لیے جدوجہد کرنے کا منصوبہ خطرہ میں پڑ گیا اور اقامت دین کے لیے براہِ راست جدوجہد کے بجائے مسلمانوں کے وجود کی حفاظت کا اہم مسئلہ سامنے آ گیا۔

جمعیۃ علماء ہند کے مشہور رہنما مولانا ابوالمحاسن سجاد بہاری نے تحریک آزادی کے دور میں حکومت الٰہیہ کے نام سے ایک منصوبہ تیار کیا تھا اور یہ الہلال اور البلاغ کے پیغام کی صدائے بازگشت تھی۔ مولانا کی اس موضوع پر سب سے پہلی کتاب ہے۔

اس منصوبہ کے مطابق ہندوستان کے بعض حصوں ۔۔۔ بہار اڑیسہ وغیرہ میں امارتِ شرعیہ قائم کر دی گئی تھی ۔۔۔ جو آج تک قائم ہے۔

یہ امارتِ شرعیہ ایک نمونہ تھا اس اصل نصب العین کا جس کا اعلان مولانا حسین احمد

مدنی نے سن ۴۵ کے خطبہ جمعیتہ علماء میں کیا تھا اور جماعت شیخ الہند کا حقیقی نصب العین تھا۔ آزادی کے بعد جماعت شیخ الہند کے یہی مرد مجاہد تھے جو بڑھاپے اور بیماری کی حالت میں شہر شہر اور گاؤں گاؤں پھر کر مسلمانوں کو تسلی دے رہے تھے اور ہندو فرقہ پرستی کا مقابلہ کر رہے تھے۔

جبکہ پاکستان کے مذہبی قائدین پاکستان میں حکومت الٰہیہ کے قیام کی قیمت پر ہندوستان کے مسلمانوں کو گیتا کی حکومت کے تحت ذلیل بنا کر رکھنے کی تجویزیں پیش کر رہے تھے۔

مسلمانوں کی جان و مال پر قیامت ٹوٹ رہی تھی اور کاغذی حکومت الٰہیہ کے علم بردار اس جلتی آگ پر تیل چھڑکنے کی سعادت حاصل کر رہے تھے۔

اصل نصب العین کی طرف جماعت شیخ الہند نے آگ اور خون کی اس بارش میں بھی اقدام کرنے سے غفلت اختیار نہیں کی۔ نعرہ بازی کی بجائے ٹھوس اقدام کیا اور دینی تعلیمی تحریک کے نام سے ملک بھر میں اسلامی دعوت و تبلیغ اور تعلیم و تربیت کے ہزاروں مراکز قائم کر دیئے ـــــ اور مولانا محمد الیاس صاحب کی تحریک تبلیغ نے نہایت خاموشی کے ساتھ کونہ کونہ پہنچ کر مسلمانوں کے اندر ایمانی حوصلہ پیدا کیا۔ اس جدوجہد میں جماعت شیخ الہند کو دو طرفہ جہاد کرنا پڑا۔ ایک طرف ہندو فرقہ پرستی اور دوسری طرف دارالشکوہی ذہنیت کے حامل اور انتہا پسند نیشنلسٹ مسلمان ـــــ

مسلمانوں کے اس طبقہ نے جماعت شیخ الہند کے اکابر پر یہ الزام تراشی شروع کی کہ ان لوگوں نے مسٹر جناح کی دو قومی تھیوری کی حوصلہ افزائی کی ہے اور درپردہ پاکستان کے قیام کی تحریک کو سہارا دیا ہے۔

مرحوم انیس الرحمان بہاری ایڈیٹر نئی زندگی اس تحریک کے قائد تھے ـــــ اس تحریک کو اندر سے کانگرس کے بعض سینیئر مسلمان لیڈر ہوا دے رہے ہیں مگر مولانا ابوالکلام آزاد کی بھاری بھرکم شخصیت کے مقابلے میں وہ کھل کر سامنے آنے کی جرأت نہیں رکھتے تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے کانگرس اور حکومت کے اندر رہنے سے مذہب پسند مسلم

قیادت کو جو ٹھوس فائدہ پہنچا وہ ناقابل بیان ہے۔

شروع ہی میں اگر یہ انتہا پسند نیشنلسٹ غالب آجاتے تو واقعی ہندوستان میں اسلامی تہذیب و ثقافت کو زندہ رہنے میں بڑی مشکلات پیش آتیں۔ ایک طرف ہندو فرقہ پرستی کے حملے ہوتے اور دوسری طرف سے اندر کے منافقین اسلامی قدروں کو نقصان پہنچانے کی سازشیں کرتے رہتے ــــ

مولانا مدنیؒ نے آزادی کے بعد سرکاری خطاب اور اعزاز قبول کرنے سے انکار کر دیا، مولانا کے بھائی اور بھتیجے سعودی عرب میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے ان کے اصرار کے باوجود مولاناؒ نے مدینہ منورہ میں قیام کرنے پر ہندوستان کے مظلوم مسلمانوں کے ساتھ رہنا پسند فرمایا،

مولانا مدنیؒ تصوف و طریقت میں مولانا تھانویؒ کے مقابلہ میں بہت نرمی اختیار کرتے تھے مگر آزادی کے بعد مولانا کے رویہ میں سختی آگئی تھی اور مولانا شرعی داڑھی کے بغیر کسی کو بیعت نہیں فرماتے تھے ــــ جبکہ اس ماحول میں مسلمان کی شکل و صورت میں چلنا پھرنا بڑی ہمت کا کام تھا اور لوگ شکل و صورت بدل بدل کر ہندوستان سے باہر جا رہے تھے ــــ یہ انفرادی تشخص کی اہمیت اور حفاظت کے اظہار کی خاطر تھا۔

آزادی کے بعد سالہا سال تک مسلمانوں کی حفاظت اور دین حق کی تبلیغ و دعوت کا سارا بوجھ جماعت شیخ الہندؒ نے اٹھایا۔

اور آہستہ آہستہ ملک کی فضا کو اس قابل بنایا کہ دوسری مسلم جماعتیں بھی مسلمانوں کے اندر کام کرنے کے لائق ہو سکیں،

جماعت اسلامی ہند ان بدلے ہوئے حالات میں بھی مشترک تعاون اور سیاسی انتخابات میں حصہ لینے کو طاغوت پرستی کہتی رہی ــــ جبکہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اسی انتخاب و الیکشن کے ذریعہ ہندو پارلیمنٹ میں جاکر مسلمانوں کی مشکلات اور ہندو فرقہ پرستی پر پوری جرأت حق کے ساتھ اظہار خیال کرتے رہے اور ہندوستان کے ضمیر کو جھنجھوڑتے رہے ــــ اور بالآخر جماعت اسلامی کے اسلام پسند رہنماؤں کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ ہندوستان

کے لیے سیکولر طرزِ حکومت اکثریت کے ہندو راشٹر سے بہتر ہے۔

ڈاکٹر صاحب پاکستان کی مسلم جماعتوں کے بارے میں جو تبصرہ کرنا چاہیں شوق سے کریں ـــــ لیکن شیخ الہندؒ جو موصوف کے نزدیک مجدد وقت تھے ان کی جماعت کے بارے میں تاریخ کا سنجیدہ مطالعہ فرما کر اظہارِ خیال فرمائیں تو بہتر ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اس تقریر میں تبلیغی جماعت کی سرگرمیوں کو بھی صرف افراد کی اصلاح تک محدود کہہ کر اس کی اہمیت کو تسلیم کرنے سے گریز کیا ہے لیکن کیا ایک صالح معاشرہ صالح افراد کے بغیر وجود میں آسکتا ہے؟ ـــــ یہ غلبۂ دین کی پہلی منزل ہے۔

اسی طرح علماء مدارس کی تعلیمی سرگرمیوں کا معاملہ ہے، اس حلقہ کی جدوجہد ایک صالح معاشرہ کے لیے دین کے معلم، امام، قاضی اور داعی تیار کرتا ہے۔

پھر کیا یہ جدوجہد غلبۂ دین کی جدوجہد سے بے تعلق چیز ہے؟ ہاں، یہ امر ضروری ہے کہ اصحابِ تبلیغ ہوں یا اربابِ مدارس اپنے اپنے دائرہ کار کے بارے میں اس خوش فہمی کا شکار نہ ہوں کہ ان کے دائرہ کار میں حق کا انحصار ہے اور جو اللہ کے بندے اسلام کو بطور ایک مکمل نظامِ ہدایت کے پیش کرنے اور بطور دین کامل کے اس کے ایک ایک پہلو کو عصرِ حاضر کے استدلال کے مطابق نمایاں کرنے اور جدید جاہلیت کی گمراہیوں پر ضرب کاری لگانے کی جدوجہد میں مصروف ہیں ان سے دور رہیں ـــــ بلکہ ان سے بدگمان ہوں ـــــ اس روش سے نہ صرف اسلامی جدوجہد کو نقصان پہنچے گا بلکہ تبلیغ و مدارس کے حلقوں پر تخریب کاری کا الزام آئے گا۔

ڈاکٹر صاحب قبلہ نے علماء کے بارے میں لکھا ہے

"اور علماء کی حیثیت زندگی کی اصل منجدھار سے ہٹی ہوئی ایک پتلی سی دھار کی ہوتی چلی گئی ـــ تا آنکہ اب وہ اپنے محدود دائرہ اثر کے جزیروں میں محصور ہو کر رہ گئے ہیں اور یہ جزیرے بھی دن بدن ـــــ نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا ـــــ کے مصداق روز بروز مختصر سے مختصر تر ہوتے چلے جا رہے ہیں"۔ (۶۶)

بڑے ادب سے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں گزارش ہے کہ علماء کی اگر یہ حالت ہے

تو یہ طنز و تعریض کی بات نہیں بلکہ رنج و ملال کی بات ہے اور اس کے محرکات میں ایک بڑا محرک مذہبی قیادت کا زوال ہے جس کی زد میں خود ڈاکٹر صاحب کی تحریک بھی ہے۔

اور یہ خوش فہمی مولانا مودودی صاحب کو بھی تھی کہ قوم کا مکمن ان کے ساتھ ہے۔ لیکن جب مرحوم اپنی قائدانہ جد وجہد اور دینی اور علمی کد وکاوش کا ثمرہ حاصل کرنے کی غرض سے عملی سیاست کے میدان میں کودے تو عبرتناک شکست کے سوا انہیں کچھ حاصل نہ ہوا جو طبقہ ان پر نوٹ نچھاور کرتا تھا اس نے ووٹ دینے سے انکار کر دیا

اور ایک بے عمل معاشرہ پر دین کے غالب کرنے کا جو تجربہ کیا گیا تھا وہ ناکام ہوگیا۔ مرحوم جب تک کتابوں اور کاغذوں پر اللہ کے دین کو غالب کرتے رہے لوگ خوش ہوتے رہے اور جب ان کی زندگیوں پر دین کو غالب کرنے نکلے۔

اور اجتماعی وسائل اور مادی ذرائع پر خدا کے نیک بندوں کو بٹھانے کے لیے خیر امت اور امتِ مسلمہ سے ووٹ مانگے تو مرحوم نے کوفہ کے امام مسلم کی طرح اپنے آپ کو تنہا پایا۔ چند رفقاء بادفاء کے علاوہ مجھے امید ہے کہ جس طرح ڈاکٹر صاحب نے تقلید کے مسئلہ کی وضاحت کر کے علماء کرام کو مطمئن کرنے کی سنجیدہ کوشش کی ہے، اسی طرح موصوف امامت اور امارت کے مسئلہ کو دعوتِ دین کی تحریک کے لیے بنیادی مسئلہ نہیں بنائیں گے۔

ظاہر ہے کہ جو اللہ کا بندہ خدا تعالیٰ کی توفیق سے باقاعدہ اس جدوجہد میں شامل ہوگا وہ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ پر رفاقت و تعاون کے عہد و پیمان میں کوئی تامل نہیں کرے گا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس احقر کو تنظیم اسلامی کے حلقہ مشاورین میں شامل فرمایا ہے حالانکہ یہ احقر اس قابل نہیں ہے پھر پاک و ہند کے درمیان ایک ایک دیوار حائل ہے، جس کو بڑی مشکل سے عبور کر کے ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کا شرف حاصل ہوتا ہے، بہرحال ڈاکٹر صاحب جس انقلابی دعوت کو لے کر اٹھے ہیں اس کے بارے میں اسلام کے لیے بننے والے دیش میں یہ توقع بے جا نہیں کہ وہ تحریک اگر ارباب اقتدار کے جبر و جہد سے محفوظ رہی تو انشاء اللہ کامیاب ہوگی اور ہمارا اس تحریک سے تعلق رضائے الٰہی کا سبب بنے گا۔ انشاء اللہ

مسئلہ رجم

چند اشکالات — اور اُن کے جوابات

مولانا سید حامد میاں رحمہ اللہ مہتمم جامعہ مدنیہ لاہور

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم ط

مسئلہ رجم کے بارے میں آجکل یہ سوال اُٹھتا ہے کہ رجم حد زنا ہے یا تعزیری کارروائی ہے۔ نیز یہ قرآن و حدیث سے ثابت ہے یا نہیں۔ چونکہ بہت سے مسلمان اس بارے میں تفصیل جاننی چاہتے ہیں۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ثبوت کے لئے دلائل جمع کر دی جائیں۔ لوگوں کا عام خیال یہ سننے میں آیا ہے کہ رجم کی روایتیں بخاری مسلم وغیرہ میں آئی ہیں اور یہ کتابیں تیسری صدی میں لکھی گئی ہیں۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایک آدمی اگر ایک بات کہے اور وہ دوسرے سے اور دوسرا تیسرے سے کہے تو آٹھویں دسویں آدمی تک پہنچتے پہنچتے وہ بات بدل جاتی ہے۔

ان دو اعتراضات کے ذریعہ چکڑالوی پرویزی جو در اصل افکار کے اعتبار سے معتزلہ ہیں، اسلام کے مسلمہ عقائد و احکام میں شکوک پیدا کرتے ہیں۔

اس لئے آجکل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ علماء کو دلائل یعنی حدیثیں وہ پیش کرنی چاہئیں جو بخاری و مسلم وغیرہما رحمہم اللہ سے پہلے گذرے ہوئے محدثین کی کتابوں میں موجود ہیں لہٰذا ہم اس مضمون میں وہی روایات پیش کریں گے۔

دوسرے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ حدیثوں کی روایت میں ہمیشہ سب سے زیادہ اس بات کو پرکھا جاتا ہے کہ محدث کی قوت حافظہ کتنی ہے۔ محدث اسی کو مانا جاتا تھا کہ جس کی روایتوں کو بار بار آزمایا جا چکا ہو کہ اس کی روایتوں میں ذرا بھی فرق نہیں آتا ورنہ اس سے حدیث نہیں لی جاتی تھی۔ عمر کا لحاظ بھی رکھا جاتا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ عمر کے آخری حصہ میں اس کا حافظہ متاثر ہو گیا ہو۔ جن محدثین کا حافظہ آخری عمر میں متاثر ہوا ہے ان کے

بارے میں یہ صراحت کردی گئی ہے کہ فلاں محدث کا حافظہ اس کی وفات سے اتنے سال پہلے متغیر ہوگیا تھا لہٰذا جن شاگردوں نے اس دور سے پہلے ان سے روایات سنی ہیں وہ معتبر ہیں جنہوں نے اس دور کے بعد سنی ہیں وہ معتبر نہیں ہیں - ہر آدمی کی ولادت، وفات علمی سفر، قوتِ حافظہ اس کی عادات کہ وہ حدیث کے بارے میں کتنی احتیاط کرتا تھا۔ سنتے ہی مان لیتا تھا یا اسکی تحقیق بھی کرتا تھا یہ سب معلومات تحریراً جمع کی گئی ہیں۔ خود با اعتماد ہونے کے لئے ثقہ کا لفظ لکھا جاتا ہے - اور اگر اسکی عادت تحقیق کی بھی تھی تو اُسے ثبت بھی لکھتے ہیں اس طرح علم حدیث کے تمام راویوں کے حالات اسماء الرجال کی کتابوں میں لکھے ہوتے موجود ہیں - (کتاب الجرح والتعدیل - التاریخ الکبیر - تہذیب الکمال، میزان الاعتدال - تاریخ یحیی ابن معین - لسان المیزان تہذیب التہذیب طبقات ابن سعد کتاب المجروحین - کتاب الضعفاء وغیرہ کو تو دستیاب ہیں ان میں تقریباً بیس ہزار لوگوں کے حالات ہیں - یہ کتابیں اسماء الرجال کی کتابیں کہلاتی ہیں : حدیث لینے کے بارے میں احتیاط کی حد انتہائی رہی ہے اگر کسی شخص کے بارے میں یہ معلوم ہوجاتا تھا کہ یہ جذبات میں کبھی غلط بات کہہ جاتا ہے تو ایسے شخص سے بھی روایت نہیں لیتے تھے۔

امام بخاری اور مسلم وغیرہ تک تین یا چار یا پانچ واسطوں سے حدیث پہونچی ہے - ان میں ہر شخص ان شرائط پر پورا اترتا ہے جو اوپر بیان کی گئیں ان کی روایتوں میں اور اُن محدثین کی روایتوں میں جو کوفہ بغداد مین مدینہ منورہ شام اور مصر میں گذرے، باوجود ذرائع مواصلات نہ ہونے کے انتہائی یکسانیت ملتی ہے - بخارا سمرقند نیشاپور اور ترمذ کے محدثین کی کتابیں لے لیجئے جو دُنیائے اسلام کے مشرق میں تھے اور امام ملحادی کی روایات لے لیجئے جو مصر میں دنیائے اسلام کے غربی حصہ میں گذرے ہیں ان میں جملے اور سطروں کی سطریں ملتی چلی جائیں گی -

اب آپ غور کریں کہ اگر ان شرائط پر پورے اترنے والے سمجھدار اور لائق ترین چار پانچ آدمی لائن میں لگا کر اپنی ایک بات آخری آدمی تک آپ پہنچانا چاہیں تو وہ بات بعینہٖ پہنچے گی یا بدل جائے گی — آپ سی - ایس، پی - اور پی، سی، ایس کرنے والوں میں بہترین حافظہ والے چن لیں پھر اس بات کا تجربہ کریں تو جو بات پہلے

آدمی نے کہی ہوگی بعینہٖ وہی بات آخری آدمی کہے گا یہ تو عام بات کا عام جواب ہے لیکن محدثین کی شرائط پر پورے اترنے والے لوگ لئے جائیں جو فی الوقت مل تو جائیں گے مگر لاکھوں میں ایک ملے گا جیسے یہ محدثین لاکھوں میں ایک تھے پھر ان میں سے ہر ایک ایسا ہو کہ وہ اس علم سے پوری دلچسپی رکھتا ہو اور ہر شخص کو یاد کرنے کا موقع بھی دیا جائے پھر وہ دوسرے کو اور دوسرا تیسرے کو بات پہنچائے یعنی ان کے حافظہ کا یہ حال ہو کہ ایک دفعہ ہی میں پوری بات ٹیپ کی طرح محفوظ ہو جاتی ہو اور مزید یاد کرنے کا موقع بھی دیا جائے پھر تیسرے چوتھے آدمی تک بات نہیں بدل سکتی۔ تجربہ کے طور پر ایسا امتحان ممکن بھی ہے اگرچہ محدثین کی جانچ اور ان کے امتحانات پھر بھی بہت زیادہ اور ساری عمر ہوتے رہے ہیں۔

ایسے تمام اصول کہ روایت کرنے والے کیسے ہوں اور روایت کے کیا کیا قاعدے ہیں۔ یہ بھی سب موجود ہیں۔ معرفۃ علوم الحدیث، المحدث الفاصل، کفایہ فی علم الروایہ، مقدمہ ابن صلاح، تدریب الراوی، شرح نخبۃ الفکر، الرفع والتکمیل۔ ممکن الحصول کتابیں ہیں۔ ان قواعد کے مطابق ہر روایت کا درجہ مقرر کیا جاتا ہے۔ یہ اصول حدیث کی کتابیں کہلاتی ہیں۔

بہت سی حدیثیں ایسی ہیں جن میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کام نقل کئے گئے ہیں۔ مثلاً آپ جہاد میں جاتے ہوئے فلاں باغ سے گذرے وہاں باغ کے پھل کے وزن کا اندازہ لگایا اس قسم کی روایات جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حرکات و سکنات سے تعلق رکھتی ہوں بہت ہیں، ان میں الفاظ بدلنے سے مطلب ایک ہی رہتا ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو قاعدے اصول مقرر فرما دیئے ان میں الفاظ بدلیں گے تو بھی مفہوم ایک ہی رہے گا میراث کے قواعد کوئی بھی حساب دان احادیث سامنے رکھ کر یاد کرلے تو قاعدہ وہی رہے گا۔

لیکن محدثین نے اتنی احتیاط برتی ہے کہ ان میں بھی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ادا ہونے والے کلمات ہی باقی اور محفوظ رکھے ہیں۔ اس احتیاط کے ساتھ تین چار واسطوں سے امام بخاری و مسلم وغیرہم تک حدیثیں

پہونچی ہیں اور انہوں نے اپنی اپنی کتابیں اپنے اپنے معیار اور نقطۂ نظر سے لکھی ہیں۔
نہیں ۔ تحریر حدیث صحابۂ کرام کے زمانہ میں ہونے لگی تھی امام زہریؒ کے
زمانہ میں جو صحابۂ کرام کا زمانہ تھا یہ دستور عام ہو چکا تھا (الحفاظ للذہبی ص ۳۶۲
ج ۱ ومثلہٗ فی لسان المیزان) اس بارے میں ہم نے الگ باحوالہ مضمون لکھا ہے اس
تحریر کے ساتھ وہ جمع نہیں ہو سکتا ۔ لیکن ہمیں کوئی مسئلہ ثابت کرنے کے لئے ان ہی
کتابوں پر انحصار کرنا پڑے ایسا ہرگز نہیں ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ
وغیرہ ، امام بخاریؒ و مسلم وغیرہ سے بہت پہلے گذرے ہیں ان کی پیدائش حسب اختلاف
مؤرخین ۸۰ھ میں امام بخاری کی پیدائش سے ایک سو چونتیس سال پہلے ہوئی ورنہ
کم از کم ایک سو چودہ سال پہلے ہوئی جب وہ پیدا ہوئے تو امام اعظم کا مسلک (مسائل
اجتہادیہ) تمام دنیا میں پھیل چکا تھا ۔ جو دلیلیں یعنی حدیثیں امام اعظم کو پہونچیں انہوں
نے ان سے مسائل سمجھنے کے اصول وضع کئے (اصول فقہ) اور مسائل استنباط کئے
(یعنی نکالے) ۔ وہ دنیا بھر کے علماء میں پہونچے اس طرح ہر حدیث اور مسئلہ دنیا
بھر کے علماء کے بیشتر حصہ نے مانا اس پر عمل کیا اور فیصلے دیئے ۔ ایسے مسائل کا انکار ۔
انکار حقیقت کے مترادف ہوگا ۔ دنیائے اسلام کے چاروں امام اسی صد سالہ عرصہ
میں گذرے ہیں جو امام بخاریؒ سے پہلے کا دور ہے ۔

اس لئے مسئلہ رجم کے بارے میں مناسب ترین طریقہ یہ ہے کہ دنیا میں ان
ہی معروف و مسلّم ائمہ اربعہ کی کتابوں میں جو روایات ہیں وہ اس مضمون میں لکھ
دی جائیں تاکہ معلوم ہو کہ ہر مسئلہ پر پوری امت کا اتفاق چلا آرہا ہے تردد کی
بھی گنجائش نہیں ۔

ائمہ اربعہ میں سب سے پہلے امام جنکی علمیت و تقویٰ پر خود بخود اُمت مسلمہ کے
سب سے بڑے حصہ نے اعتماد کیا اور ان کے مسلک و فتاویٰ پر چلنے لگے وہ امام اعظم
ابوحنیفہ النعمان ہیں ۔ رحمہ اللہ ۔ امام اعظم تابعی بھی ہیں وہ حضرت انس رضی اللہ
عنہ کی زیارت سے مشرف ہوئے ہیں ۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں :

رأی انس بن مالک غیر مرة لما قدم علیھم	انہوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو متعدد بار دیکھا ہے

الکوفتر (تذکرۃ الحفاظ   جب وہ ان کے یہاں کوفہ آئے۔

ج ۱ ص ۱۶۸)

حافظ ابن حجر عسقلانی نے تحریر فرمایا ہے۔

رأی انسًا — حضرت انس رضی اللہ عنہ کو دیکھا ہے۔

تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۳۳۹

۲ - دوسرے ایسے ہی جلیل القدر امام جن کے اصول و مسائل پر علماء امت کا دوسرا حصہ خود بخود بامر اللہ چلتا آیا ہے امام دار الھجرۃ (مدینہ منورہ) امام مالک رحمۃ اللہ علیہ ہیں یہ مدینہ شریف ہی میں پیدا ہوئے وہیں وفات پائی - یہ عمر میں امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے کم ازکم تیرہ سال چھوٹے تھے اور تابعی نہ تھے۔

حنفی ائمہ میں امام ابویوسفؒ امام اعظم کے شاگرد ہیں امام مالکؒ سے انہوں نے نہیں پڑھا امام محمدؒ نے امام اعظم امام ابو یوسف اور امام مالکؒ تینوں سے پڑھا ہے فقہ حنفی میں جہاں امام اعظمؒ کا ذکر آتا ہے وہاں ان حضرات کا بھی ذکر آتا رہتا ہے۔

۳ - دنیا میں ایسے تیسرے امام جنہیں ملّت اسلامیہ نے اسی طرح قبول کیا اور انکی عظمت کا اعتراف کیا امام شافعیؒ ہیں - یہ امام مالک اور امام محمدؒ دونوں کے شاگرد ہیں - حافظ ذہبی فرماتے ہیں : ثم حفظ الموطا وعرضه على مالك موطا یاد کرکے امام مالکؒ کو سنائی - وہ لکھتے ہیں : وكتب عن محمد بن الحسن وقر بختي : امام محمد بن الحسن سے انہوں نے بختی اونٹ کے وزن کے برابر کتابیں لکھیں (تذکرہ)۔

۴ - دنیا میں ایسے چوتھے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ ہیں انہوں نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے امام مالکؒ کی روایات لیں اگرچہ وہ ان کے تقریباً ہمعصر تھے۔ لیکن امام شافعیؒ کے شاگرد تھے اور امام ابو یوسف کے بھی حافظ ذہبی نے امام ابو یوسف کے حالات میں لکھا ہے - وعنه محمد بن الحسن الفقيه احمد بن حنبل - ان سے امام محمد اور امام احمد بن حنبل نے پڑھا ہے (تذکرۃ الحفاظ للذہبی ج ۱ ص ۲۹۲) —— امام ابو یوسف سے امام لیثؒ نے بھی روایت لی ہے لیث امام مالکؒ کے معاصر تھے ان کی روایت عن یعقوب عن النعمان، امام طحاویؒ

نے اپنی جلیل القدر تصنیف شرح معانی الآثار باب القراءۃ خلف الامام میں دی ہے یعقوب (ابو یوسف) نعمان (ابو حنیفہ)

امام شافعیؒ کی عمر کا آخری حصہ مصر میں گذرا ہے وہ فرماتے ہیں کہ لیث لیس بدون مالکؒ الا ان اصحابہ ضیعوہ یعنی لیث کا علمی مقام امام مالک سے کم نہیں ہے سوائے اسکے کہ ان کے شاگردوں نے ان کے علوم محفوظ نہیں رکھے ضائع کر دیئے امام شافعیؒ جب مصر پہنچے ہیں تو لیثؒ وفات پا چکے تھے۔ ان کے شاگردوں سے انکی ملاقاتیں اور مذاکرات ہوئے۔

مسئلۂ رجم ان مسائل میں سے ہے جو اسلام سے پہلے عیسائیوں میں اور ان سے پہلے یہودیوں میں انبیاء کرام پر نازل کردہ کتابوں میں موجود آرہے تھے اس لئے جب یہ مسئلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آیا تو قرآن پاک کی یہ آیت نازل ہوئی۔

وَكَيْفَ يُحَكِّمُونَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ ۭ وَمَآ اُولٰۗىِٕكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ۔	اور وہ تجھ کو کس طرح منصف بنائیں گے اور انکے پاس تو توراۃ ہے جس میں کہ اللہ کا حکم (موجود) ہے۔ پھر اسکے بعد (بھی) وہ (اس حکم سے) پھرتے ہیں۔ اور وہ ہرگز ماننے والے (ایمان لانے اور اس پر قائم رہنے والے) نہیں ہیں۔
پ۶ سورہ المائدہ آیت ۴۳	

اور ارشاد ہوا:

اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا۔	ہم نے توراۃ نازل کی اس میں ہدایت اور نور ہے اس پر یہود کے فیصلے کرتے تھے (ان کے) پیغمبر جو کہ اللہ کے حکم بردار تھے۔
پ۶ سورۃ المائدہ آیت ۴۴	

یعنی یہ مسئلہ آپ کے زمانہ کے یہودیوں کو معلوم تھا توراۃ میں موجود تھا۔ اور

تورات مقدس کے احکام پر انبیاء کرام فیصلے کرتے آئے تھے اور ان کے بعد علماء بھی
وَالرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ - آیت ۴۴
نیز ارشاد ہوا کہ یہ احکام جیسے تورات میں اتارے گئے تھے ویسے انجیل میں بھی
باقی رکھے گئے تھے -

وَقَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِم بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ	ان کے پیچھے ان ہی (موسیٰ علیہ السلام) کے نقش قدم پر ہم نے عیسیٰ بن مریم کو بھیجا تصدیق کرنے والا اپنے سامنے تورات کی -
آیت ۴۶	
وَلْيَحْكُمْ أَهْلُ الْإِنجِيلِ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فِيهِ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ -	اور چاہیئے کہ حکم (فیصلے) کریں انجیل والے جو اللہ نے اس میں اتارا ہے اس کے موافق اور جو کوئی اللہ کے اتارے ہوئے (حکم) کے موافق حکم (فیصلہ) نہ کریں تو وہی لوگ نافرمان ہیں -
پ ۶ سورہ المائدہ آیت ۴۷	

ان آیات کی تفسیر سمجھنے کے لئے علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے ان آیات کا (تاریخی واقعہ) سبب نزول بحوالہ بخاری تحریر فرمایا ہے - کہ خیبر کے ایک یہودی مرد و عورت نے جو کنوارے نہ تھے زنا کیا باوجودیکہ تورات میں اس جرم کی سزا (رجم) سنگسار کرنا تھی مگر ان دونوں کی بڑائی مانع تھی کہ یہ سزا جاری کی جائے - آپس میں یہ مشورہ ہوا کہ یہ شخص جو یثرب میں ہے (یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ان کی کتاب میں زانی کے لئے رجم کا حکم نہیں کوڑے مارنے کا ہے - تو بنی قریظہ کے یہود میں سے کچھ آدمی ان کے پاس بھیجو کیونکہ وہ ان کے ہمسایہ ہیں اور ان سے صلح کا معاہدہ بھی کر چکے ہیں - وہ ان کا خیال معلوم کر لیں گے - چنانچہ ایک جماعت اس کام کے لئے روانہ کی گئی، کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عندیہ معلوم کرے کہ زانی محصن کی کیا سزا تجویز کرتے ہیں - اگر وہ کوڑے مارنے کا حکم دیں تو ان پر رکھ کر قبول کر لو - اور رجم کا حکم دیں تو مت مانو ان کے دیافت کرنے پر حضورؐ نے فرمایا

کہ تم میرے فیصلہ پر رضامند ہوگے ؟ انہوں نے اقرار کرلیا خدا کی طرف سے جبرئیلؑ رجم کا حکم لے آئے وہ لوگ اپنے اقرار سے پھر گئے آخر حضورؐ نے فرمایا کہ فدک کا رہنے والا ابن صوریا تم میں کیسا شخص ہے ؟ سب نے کہا آج روئے زمین پر شرائع موسویہ کا اس سے زیادہ جاننے والا کوئی نہیں - آپ نے اسکو بلوایا اور نہایت ہی شدید حلف دے کر پوچھا کہ تورات میں اس گناہ کی سزا کیا ہے باوجودیکہ دوسرے یہود اس حکم کو چھپانے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے جس کا پردہ حضرت عبداللہ بن سلام کے ذریعہ سے فاش ہوچکا تھا تاہم ابن صوریا نے جو اُن کا مسلّم معتمد تھا کسی نہ کسی وجہ سے اس کا اقرار کرلیا کہ بے شک توراۃ میں اس جرم کی سزا رجم ہی ہے بعدہ اس نے سب حقیقت ظاہر کہ کس طرح یہود نے رجم اڑا کر زنا کی سزا یہ رکھدی کہ زانی کو کوڑے لگائے جائیں اور کالا منہ کرکے اور گدھے پر الٹا سوار کرا کر گشت کرایا جائے - الحاصل حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں مرد و عورت پر رجم کی سزا جاری کی اور فرمایا اے اللہ آج میں پہلا شخص ہوں جسنے تیرے حکم کو دُنیا میں زندہ کیا اسکے بعد کہ وہ اُسے مردہ کرچکے تھے -

ان آیات سے معلوم ہو رہا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام میں وہی حکم باقی رکھا ہے جو انجیل میں تھا اور وہی حکم اس سے پہلے توراۃ میں تھا اور انجیل میں اجمالاً اسکی تصدیق تھی - (جاری ہے)

بقیہ : کیا پاکستان میں ایرانی طرز کا انقلاب ممکن ہے ؟

کے نقطۂ نظر سے بہت اہمیت کی حامل ہے - نیز یہ کہ ایران کی تبدیلی کو اسلامی انقلاب قرار دیا بھی جاسکتا ہے یا نہیں ! اس موضوع پر ان شاء اللہ آئندہ گفتگو ہوگی -

وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم !!

كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَة

محمد یونس جنجوعہ

بدعت کا لفظی معنیٰ نئی چیز، ایجاد اور انوکھے کے ہیں لیکن اسلامی اصطلاح میں یہ لفظ ایسے امور پر بولا جاتا ہے جو دین میں نئے نکالے گئے ہوں۔ امور دین میں ہر قسم کے اضافے کو مذموم قرار دیا گیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیوی زندگی کے آخری ایام میں تکمیل و اتمام دین کی خوشخبری سنا کر یہ بات بالکل واضح کر دی گئی کہ امور دین میں اب کسی قسم کی کوئی خامی باقی نہیں رہی بلکہ دین تکمیل اور اتمام کے درجے کو پہنچ چکا ہے۔ مشاہدہ بھی یہی بات بتاتا ہے کہ درجہ کمال صرف ایک ہی ہوتا ہے جو کمی بیشی کا متحمل نہیں ہو سکتا جس طرح کمی درجہ کمال میں نقص پیدا کرتی ہے اسی طرح اضافہ بھی قصور پیدا کرتا ہے کیونکہ جس شئے میں اضافے کو قبول کرنے کی گنجائش موجود ہو وہ کامل نہیں ہو سکتی۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو بڑی صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے ہمارے اس دین میں کوئی نئی بات نکالی جو اس میں نہیں ہے پس وہ مردود ہے۔ (مشکوٰۃ بحوالہ بخاری و مسلم)

حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ پیش بندی نہ کی جاتی تو دین مشکل سے مشکل تر ہوتا جاتا اور اس میں تکمیلی شان بھی باقی نہ رہتی جو چاہتا حسن و خوبی کے نام پر اس میں اضافہ کرتا اور یہ اضافے اصل دین کا اسی طرح حلیہ بگاڑ دیتے جس طرح یہود و نصاریٰ نے اسلامی تعلیم کا ستیاناس کیا۔

دین کا پورا نظام عہد رسالت کے آخری ایام میں جاری و ساری ہو گیا اور پھر خلافت راشدہ کے دور میں بھی رائج رہا اگر دور صحابہ میں چند چیزیں دین میں اضافہ معلوم ہوتی ہیں۔ تو ان کی حقیقت یہ ہے کہ صحابہ کرام نے باہمی مشورے سے کسی کام کو منشاء رسالت سمجھا اور یہ بھی جانا کہ عہد رسالت میں اس کی ترویج میں کیا چیز حائل تھی چنانچہ اس کو رائج کیا۔

ایسے امور کو اول تو ہم اس لیے بدعت نہیں کہتے کہ صحابہ کرام مزاج شناسِ رسول تھے۔ یہ بات محال ہے کہ وہ کسی بدعت پر اجماع کرتے۔ دوم اس لیے کہ خود رسول پاکؐ نے صحابہ کرام کے طریق کار کو اپنی سنت اور امت کے لیے قابل تقلید قرار دیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا تم پر میری سنت اور میرے خلفائے راشدین کی سنت کو اختیار کرنا لازم ہے۔ مثال کے طور پر تراویح کا نظام نہ عہد رسالت میں رائج تھا اور نہ ہی عہد صدیقی میں۔ مگر حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے عہد خلافت میں نماز تراویح کا نظام قائم کر دیا جس پر تمام صحابہ کا اجماع ہوا اور کسی نے مخالفت نہ کی۔ اور امت نے اس کو سنت کے طور پر اپنایا۔ نظام تراویح کی ترویج کے ضمن میں صحابہ کرام کے سامنے یہ بات بالکل واضح تھی کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں رمضان شریف کی راتوں میں عبادت نہایت پسندیدہ ہے نیز یہ کہ نظام تراویح کے قیام سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کا قوی امکان تھا کہ یہ عبادت اپنی عظمت کی وجہ سے فرضیت کے درجے میں آجائے گی اور یہ بات امت کے عام افراد پر بھاری ہو گی۔ دورِ رسالت کے اختتام پر سلسلہ وحی بند ہو جانے کے باعث رمضان کی راتوں کے قیام کا فرض ہونا ممکن نہ رہا تو امیر المؤمنین عمر فاروقؓ نے جملہ صحابہ کرام کے مشورے سے رسول پاکؐ کی پسندیدگی کے باعث اور حصول رضائے خداوندی کے لیے نظام تراویح کو رائج کر دیا۔ وگرنہ عہد صحابہ میں بدعت کی روک تھام کا پورا انتظام کیا گیا اور کسی ایسی بات کو دین میں داخل نہ ہونے دیا گیا جس کی نظیر عہد رسالت میں نہ ملتی ہو۔ کیونکہ اس ضمن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی واضح تعلیمات ان کے سامنے تھیں یہ وہی عمر فاروقؓ ہیں کہ جب لوگوں نے بیعت رضوان والے ببول کے درخت کا احترام کرنا اور زیارت کے لیے جانا شروع کر دیا تو انہوں نے اس درخت کو جڑوں سمیت اکھاڑ پھینکا کہ اس طرح کوئی بدعت رواج نہ پائے۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سب سے بہتر بات خدا کی کتاب اور بہترین طریقہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے اور بدترین کام وہ ہیں جن کو دین میں نیا نکالا گیا ہو۔ اور ہر بدعت یعنی دین میں نئی نکالی ہوئی چیز گمراہی ہے۔ (مشکوٰۃ بحوالہ مسلم)

جو لوگ بدعت کی برائی میں لچک پیدا کرتے اور حسن ظن اور حسن نیت کی دلیل

پیش کرتے ہیں انکا خیال صحیح نہیں کیونکہ بدعت تو کہتے ہی اس کام کو ہیں جو دین کا کام سمجھ کر اور حصول رضائے الٰہی کے لیے اختیار کیا جائے لیکن اس کی مثال سنت میں نہ ملتی ہو کیونکہ دین میں نئی چیز کا اطلاق اس چیز پر تو ہو نہیں سکتا جس میں فی نفسہٖ برائی موجود ہو۔ بلکہ برائی کی تو دین میں سرے سے گنجائش ہی نہیں رکھی گئی۔ البتہ بزعم فکر انسانی دین میں اچھائی کے اضافے کا امکان موجود تھا جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری صراحت کے ساتھ ختم کر دیا تاکہ دین اپنی اصلی صورت میں اور تکمیلی شان کے ساتھ قائم رہے۔

اسلامی ممالک میں عام طور پر اور برصغیر میں خاص طور پر جن بدعات کو اختیار کیا گیا ہے ان کے پیچھے بھی حبِ رسول اور حصولِ رضائے الٰہی کے جذبے کا دعویٰ کیا جاتا ہے لیکن اس بات کو فراموش کر دیا جاتا ہے کہ حبِ رسول اور رضاءِ الٰہی کی بہترین صورت تو صحابہ کرامؓ نے اختیار کر رکھی تھی اگر حبِ رسول اور حصول رضائے الٰہی کے کچھ تقاضے ان بدعات کو اپنا کر پورے کیے جا رہے ہیں جو صحابہ کے دور میں رائج نہ تھیں تو صحابہ کرام کے اسلام میں خامی تسلیم کرنا پڑتی ہے جو محال ہے کیونکہ صحابہ کرامؓ کی جماعت کے طرزِ عمل کو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے قابل اعتماد جانا ہے اور خدائے بزرگ و برتر نے اس طائفہ کی تعریف کی ہے۔ صحابہ کرامؓ نے حبِ رسول اور دینی استقامت کے تقاضے پورے کرنے کے لیے چھوٹی سے چھوٹی سنت کو مضبوطی سے پکڑا اور عملاً اختیار کیا۔ انہوں نے پوری زندگی قرآن و سنت کے مطابق بسر کی البتہ حبِ رسول اور دینی استقامت کی نمائش کے لیے جلوس اور میلاد کی محافل منعقد نہ کیں۔ ذکرِ نبیؐ تو خود خدا نے بلند کر دیا جو عہدِ رسالت، عہدِ صحابہ اور موجودہ دور میں بھی بلند ہی ہے اور بلند رہے گا لیکن اگر بلند بانگ نعروں، بے ہنگم اجتماعات، پر از تعصب مجالس اور نمائشی جلسوں سے وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ کا تقاضا پورا ہوتا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ تقاضا نہ عہدِ رسالت میں پورا ہوا اور نہ عہدِ صحابہ میں۔ لہٰذا تسلیم کرنا پڑے گا کہ استقامت فی الدین کے تقاضے جس طرح جماعتِ صحابہ نے پورے کیے وہی جامع اور مکمل ہیں۔ آج بھی اگر حبِ رسول اور رضائے الٰہی کے جذبہ کے تحت بدعات کو رواج دینے والے لوگ اپنے دیگر امور میں تابعِ سنت نظر آئیں تو ان کے جذبے کو حسنِ ظن کے تحت لانے کا جواز پیش کیا جا سکتا ہے لیکن جب ان نمائشی محافل میں اکثریت بے عمل بلکہ بدعمل لوگوں کی ہوتی ہے جو نماز کی پابندی

وعدے کی پاسداری، اخلاق کی بلندی، کسب رزق حلال کی اہمیت سے بھی بے خبر ہوتے ہیں ایسے لوگوں کو کسی نمائشی جلوس میں نعرے لگاتے دیکھ کر اللہ کا نبیؐ اور خود خدائے علیم و خبیر تو دھوکہ نہیں کھا سکتے البتہ بے شعور لوگوں میں وہ اپنے عاشق رسول ہونے کا رعب جما سکتے ہیں۔

اصل بات تو یہ ہے کہ دین میں شامل تمام امور کے تقاضے صحابہ کرامؓ نے بطریق احسن پورے کر دیئے اور امت کی راہنمائی کر دی اب دین میں کسی امر کا اضافہ خواہ وہ کتنی ہی حسن نیت اور حصول رضائے الٰہی کے لیے ہو قابل قبول نہیں۔ قرآن پاک کی سورہ حدید کے آخری رکوع میں مذکور ہے کہ نصاریٰ نے گناہوں سے بچنے اور حصول رضائے الٰہی کی خاطر ترک دنیا کی بدعت اختیار کی۔ جو اللہ تعالیٰ نے ان پر لازم نہ کی تھی چنانچہ وہ اس کو نباہ نہ سکے معلوم ہوا کہ گناہوں سے بچنے اور رضائے الٰہی کے حصول کے لیے وہ کوشش اور طرز عمل بھی بدعت ہے جو شارع نے دین میں شامل نہ کیا ہو۔ حالانکہ گناہوں سے بچنا اور حصول رضائے الٰہی امر محمود ہے مگر کوئی بات محمود نہیں ہو سکتی جب تک اس کا طریقہ تعلیمات نبوی کے مطابق نہ ہو۔ تین دن کے بھوکے کو روزے کا ثواب نہ ملے گا مگر سنت نبوی کے مطابق چند گھنٹے کا روزہ مقبول و مبرور اور کار ثواب ہوگا۔

حدیث پاک میں بار بار کتاب و سنت پر انحصار کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ حضرت عرباضؓ بن ساریہ سے روایت ہے آپؐ نے فرمایا ..... پس تم میں سے جو شخص میرے بعد زندہ رہے اور اختلاف کثیر دیکھے ایسی حالت میں تم پر لازم ہے کہ میرے اور میرے خلفائے راشدین کے طریقہ کو مضبوطی سے پکڑو اور اسی طریقہ پر بھروسہ کرو اور اس کو دانتوں سے مضبوط پکڑے رہو اور بچو تم دین میں نئی باتیں پیدا کرنے سے اس لیے کہ ہر نئی بات بدعت ہے اور بدعت گمراہی ہے۔ (مشکوٰۃ)

حب رسول اور حصول رضائے الٰہی کا مسنون طریقہ تو یہ ہے کہ اسوۂ حسنہ کو اپنایا جائے۔ اظہار دین کے پیغمبرانہ مشن کو پورا کرنے میں کوشش کی جائے۔ مسلمانوں میں اتفاق و اتحاد پیدا کر کے ناقابل شکست قوت بنا دیا جائے۔ اگر یہ بات نہیں ہے تو تمام نمائشی اور اضافی امور بے معنی اور فریب محض ہیں کیونکہ اگر ہم حب رسول اور استقامت چاہتے ہیں تو صحابہ کرام کے طرز عمل سے اچھی مثال کہیں اور سے نہیں مل سکتی۔

دینِ اسلام خالق کائنات کا مرتب کردہ دین ہے اور انسانوں کے لیے ہے جنہیں خود اس علیم و خبیر نے بنایا ہے لہٰذا اس دین کا کامل ہونا واضح ہے اگر غور کیا جائے تو اس کی ہر بات میں تکمیلی شان نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دین اسلام نے دوسرے ادیان باطلہ کی کسی چیز کو اخذ نہیں کیا بلکہ دوسرے ادیان اور نظاموں نے دینِ اسلام سے بہت سی باتیں اخذ کیں لیکن یہ دینِ اسلام کے پیروکاروں کا زوال اور دین کی تکمیلی شان سے بے خبری ہے کہ ان کو دوسرے نظاموں میں حسن اور کشش نظر آنے لگی۔ برصغیر میں ہندو اور مسلمان سینکڑوں سال ساتھ ساتھ رہے۔ ہندو اپنے ایک تہوار پر اپنی عمارات پر روشنی کرتے تھے مسلمانوں نے بھی ایک تہوار ایجاد کر لیا اور اپنی عمارتوں پر چراغاں کے علاوہ آتش بازی کا مظاہرہ بھی کرنا شروع کیا وہ یہ بات بھول گئے کہ دین اسلام تو فضول خرچی سے روکتا اور ریاکاری (نمائش و نمود) سے روکتا ہے۔ عیسائیوں نے یوم ولادتِ مسیحؑ پر جشن کا اہتمام کیا مسلمانوں نے ان کی نقالی کی اور لغویات میں نصاریٰ کو پیچھے چھوڑ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جس طرح عیسائیوں نے جذبہ فراریت کے تحت عیسیٰ علیہ السلام کی اصل تعلیمات کو چھوڑ کر نمائشِ محبت رسول پر اکتفا کیا اسی طرح مسلمان بھی کتاب و سنت کے احکام کی پیروی چھوڑ کر ناقص مسلمان ہو گئے تو اس نقص کو چھپانے کے لیے وہ بھی نمائشی اظہار محبت کے ذریعے بدعملی کے باوجود بزعم خویش اتقیاء و اصفیاء بن رہے ہیں۔

دین اسلام کی تعلیم تو یہ تھی کہ رسول پاکؐ کے طریقوں کو اپنایا جائے اور آپؐ کے اور آپ کے صحابہ کرامؓ کی زندگیوں کے مطابق طرزِ عمل اختیار کر کے صحت مند اسلامی معاشرہ استوار کیا جائے لیکن سہل انگاری، غفلت، سستی، کم ہمتی اور ضعف ایمان نے اصل سے توجہ ہٹا کر خود ساختہ رسوم کی پیروی پر آمادہ کر دیا۔ اور چند نمائشی طریقوں سے حصول مقصد کی باطل امید پیدا کر دی۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے جسے حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں "جس شخص نے میری امت کے بگڑنے کے وقت میری سنت کو اپنا راہنما بنایا اُس کو سو شہیدوں کا ثواب ملے گا" (مشکوٰۃ)

بدعات کے خوگر لوگوں پر جب بدعات کی مذمت واضح کی جائے تو وہ کہتے ہیں اگر نئی چیزیں مثلاً عینک، لاؤڈ سپیکر، ہوائی جہاز، جدید طرزِ تعمیر کو اختیار کرنا جائز ہے تو گیارہویں شریف، عرس اور تعزیے، محافل میلاد کیوں ناجائز ہوئیں جبکہ ان میں اتفاق

فی سبیل اللہ اور درود و سلام بھی ہوتا ہے لیکن یہ بات کہتے ہوئے وہ بھول جاتے ہیں کہ دین میں نئی چیز بدعت ہوتی ہے مگر دنیا کی نئی چیزیں ایجادات کہلاتی ہیں جن سے فائدہ اٹھانا جائز ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ کہتے ہیں کہ جب معروف سیاسی، سماجی، مذہبی اور قومی راہنماؤں کی سالگرہ منائی جاسکتی ہے تو نبی اکرمؐ کے میلاد منانے میں کیا حرج ہے تو یہاں بھی غلط فہمی واضح ہے کہ سیاسی اور قومی اہمیت کی شخصیات کے نام اور کارناموں کو زندہ رکھنے کیلئے ہم ان کی یاد میں ایام مناتے ہیں اور اگر ایسا نہ کیا جائے تو ان نامور ہستیوں کے معدوم ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے لیکن آنحضرتؐ کی حیثیت ان لوگوں سے مختلف ہے کیونکہ آپؐ کے ذکر کی بلندی اور دوام کا خود کار نظام خالق کائنات نے دنیا میں جاری فرما دیا ہے لہذا اس بات کی حاجت ہی نہیں رہی کہ مصنوعی طریقوں سے آپؐ کے ذکر کو بلند کیا جائے بلکہ ایسا کرنے سے حسن نیت کے باوجود منفی نتائج برآمد ہونا لازمی ہے کیونکہ دیگر شخصیات کے ساتھ ہمارا جو تعلق ہے وہ محض دنیاوی ہے لیکن آنحضرتؐ کے ساتھ جو تعلق ہے وہ سراسر دینی ہے اور دینی تعلق کے تقاضے دنیاوی تعلق کے تقاضوں سے مختلف ہیں اس فرق کو بھی ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کمال محبت کے باوجود خلافت راشدہ میں کبھی ربیع الاول کے مہینے میں ذکر رسول کی خاطر اجتماعی محافل میلاد کا اہتمام نہیں کیا گیا۔

بعض لوگ نفلی نوعیت کی عبادات کو مستقلاً اختیار کر لیتے ہیں اس حد تک تو یہ بات مستحسن ہے لیکن جب اپنے نفلی معمولات کو پوری امت پر لازم قرار دینے کی کوشش کی جائے اور اختیار نہ کرنیوالوں کو مطعون کیا جائے تو یہ امر بدعت کہلاتا ہے کیونکہ یہ دین میں نئی بات ہے۔ پوری امت کے لیے عبادات اور وظائف کو لازم قرار دینا صرف پیغمبر خدا کا منصب ہے مذکورہ عمل اختیار کرنے والے یہ بات فراموش کر دیتے ہیں کہ وہ اپنے اختیار سے تجاوز کر کے پیغمبر کی حیثیت اپنا رہے ہیں جو شرک فی الرسالت کا ارتکاب ہے۔

خود رحمت للعالمین کا اسوہ یہ ہے کہ آپؐ نے اپنے نفلی معمولات امت پر واضح تو فرما دیے لیکن لازم نہ کیے بلکہ اختیاری رکھے تاکہ امت پر بوجھ نہ ہو تو آج کون شخص پوری امت کے لیے کوئی نیا عمل تجویز کر کے رائج کر سکتا ہے۔

آج کے دور میں بدعات کو ختم کر کے صحیح اسلامی طرز زندگی اپنانے کی ضرورت ہے۔ پس سنت کے احیاء میں جس قدر محنت ہو سکے کرنا چاہیئے یہی طریقہ حصول حب رسولؐ کے لیے مستند اور مجرب ہے۔

شامِ الہدیٰ ـــــــ کراچی

(دوسری نشست)

مرتبہ: نعیم الطاف ـــــ بہ تعاون: شیخ جمیل الرحمٰن

نحمدہٗ ونصلّی علیٰ رسولہ الکریم

محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلّہ کے پاکستان ٹیلی ویژن کے مقبول و مؤثر ترین پروگرام "الہدیٰ" کے تسلسل کو کراچی میں برقرار رکھنے کے لیے جب میرے بچپن کے ساتھی شیخ منصور فیروزالدین بوبجہ مینجنگ ڈائریکٹر تاج محل ہوٹل کراچی نے ہوٹل کے وسیع و عریض اور عالی شان موتی محل آڈیٹوریم کو ہر انگریزی ماہ کی ہر آخری سوموار کو بلا معاوضہ دینے پر رضامندی کا اظہار کیا تو ۲۹ر نومبر ۸۴ء کو پہلی نشست کے انعقاد سے قریباً ایک ماہ قبل تنظیم اسلامی کراچی کے ذمہ دار رفقاء آڈیٹوریم کا جائزہ لینے کے لیے تشریف لے گئے تو اس کی وسعت کو دیکھتے ہوئے بعض رفقاء کو یہ اندیشہ دامن گیر تھا کہ اگر آڈیٹوریم پورا پُر نہ ہو سکا اور اس کا کوئی حصہ بھی خالی رہا تو اس کا خوشگوار اثر مترتب نہیں ہوگا۔ اس اندیشہ کی وجوہ یہ تھیں کہ تاج محل ہوٹل کسی رہائشی آبادی میں واقع نہیں ہے۔ اور اس روٹ پر بس یا منی بس بھی بہت کم چلتی ہیں جب کہ بعض رفقاء نہایت پُرامید تھے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے آڈیٹوریم نہ صرف بھر جائے گا بلکہ ممکن ہے کہ اپنی وسعت کے باوصف ناکافی ثابت ہو ـــ الحمد للہ آخر الذکر رفقاء کی توقع پوری ہوئی اور نہ صرف آڈیٹوریم کی تمام نشستیں پُر ہو گئیں بلکہ قریباً دو سو حضرات کو اسٹیج اور ستونوں کے درمیان فرش پر بیٹھنا پڑا۔ اس پہلی نشست کی مفصل روداد گذشتہ ماہ کے "میثاق" میں شائع ہو چکی ہے۔

"شامِ الہدیٰ" کی دوسری نشست کا ۲۶ر نومبر ۸۴ء بروز سوموار بوقت ۶½ بجے بعد نمازِ مغرب انعقاد ہوا۔ پہلی نشست کی غیر معمولی حاضری کے پیشِ نظر محدود تعداد

میں دعوت نامے ارسال کیے گئے تھے۔ نیز اخبارات میں پبلسٹی بھی نصف کر دی گئی تھی جن حضرات کو دعوت نامے ارسال کیے گئے تھے ان سے درخواست کی گئی تھی کہ عدم شرکت کی صورت میں فون پر اطلاع دے دیں اور شرکت کی صورت میں دعوت نامہ ساتھ لائیں۔ چونکہ ایسے حضرات کے لیے کرسیوں پر نشستیں محفوظ کرنے کا اہتمام پیشِ نظر تھا۔ ساڑھے چھ بجے سے قبل ہی آڈیٹوریم کی تمام نشستیں پُر ہوگئی تھیں۔ اور جو حضرات دعوت نامے ساتھ لے کر آئے تھے، ان کے لیے نشست کا انتظام کر دیا گیا تھا۔ نشستوں کے پُر ہو جانے کے بعد آنے والے حضرات اسٹیج اور کرسیوں کے درمیان فرش پر بیٹھنے شروع ہوئے جہاں قریباً ڈھائی سو افراد کے لیے سکڑ سکڑا کر بیٹھنے کی گنجائش تھی۔

ٹھیک ساڑھے چھ بجے پروگرام کا آغاز ہوا۔ آنے والوں کا تانتا بندھا ہُوا تھا۔ چنانچہ لوگوں کو اسٹیج پر بٹھانا شروع کیا گیا جہاں تقریباً دو سو افراد بیٹھ سکتے تھے۔ دس منٹ بعد اسٹیج پر بھی تِل دھرنے کی جگہ نہ رہی۔ بعد ازاں اسٹیج تک جانے والی نشستوں کے درمیان تین اطراف میں جو سیڑھیاں تھیں، نیز اسٹیج کے اور نشستوں کے درمیان دو طرف آمد و رفت کے دروازوں کے مابین جو گنجائش تھی، وہاں لوگوں نے بیٹھنا شروع کیا۔ چنانچہ قریباً سات بجے تک یہ جگہیں بھی پُر ہوگئیں۔ پھر نشستوں اور دیواروں کے درمیان جو جگہ تھی وہاں بہت سے لوگوں کو کھڑا ہونا پڑا۔ جن حضرات کو دعوت نامے بھیجے گئے تھے، ان میں سے جو حضرات پونے سات بجے تک تشریف لے آئے تھے، اُن کے لیے نشستوں کا انتظام کر دیا گیا تھا جن کو ہمارے رفقاء نے خود بیٹھ کر محفوظ کر رکھا تھا۔ لیکن ایسے حضرات جو سات بجے کے قریب یا اُس کے کچھ دیر بعد تشریف لائے، ہمیں افسوس ہے کہ ان کے لیے نشست کا انتظام کرنے سے ہم قاصر رہے۔ اکثر حضرات تو فرش پر بیٹھ گئے جن میں بڑی معزز شخصیتیں شامل تھیں۔ جیسے ایڈمرل ایم۔ آئی ارشد صاحب، چیئرمین کراچی پورٹ ٹرسٹ۔ بعض حضرات کو کوئی جگہ نہ ملنے کی وجہ سے ناچار واپس جانا پڑا۔ جن میں ملک کی نامور و محترم شخصیت جناب حکیم محمد سعید صاحب جیسی ہستی بھی شامل تھی۔ اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کتنی معزز شخصیتوں کو فرش پر بیٹھنا پڑا یا جگہ نہ ملنے کی وجہ سے ناچار واپس جانا پڑا۔ اوپر گیلری میں خواتین کی

نشستیں اور درمیانی سیڑھیاں خالی جگہیں بھی پُر ہوگئی تھیں اور اکثر خواتین کو گیلری میں داخل ہونے کے راستوں کے باہر کے ننگے فرش پر بیٹھنا پڑا۔ الغرض پورے آڈیٹوریم میں "تل دھرنے کی جگہ بھی نہیں تھی" کے محاورے کی عملی تفسیر کا نقشہ بنا ہُوا تھا۔ محتاط اندازہ یہ ہے کہ شرکاء کی تعداد کسی طرح بھی تین ہزار سے کم نہیں تھی۔ جس میں ہر شعبۂ زندگی (Walk of Life) سے تعلق رکھنے والے حضرات شریک تھے۔ اور کم و بیش ڈھائی سو افراد کو جگہ نہ ہونے کی وجہ سے ناچار واپس جانا پڑا۔

جیسا کہ سابقہ روداد میں عرض کیا جا چکا ہے کہ ٹی۔ وی پر جب "الہدیٰ" بند کیا گیا تھا، تب تک مطالعۂ قرآن حکیم کا نصف حصہ مکمل ہُوا تھا جو سورۃ الحجرات پر ختم ہوتا ہے۔ چنانچہ اس تسلسل کو قائم کرنے کے لیے "شامِ الہدیٰ" کی پہلی نشست میں محترم ڈاکٹر صاحب موصوف نے سورہ حجرات ہی کا درس دیا تھا۔ یہ سورہ مبارکہ عملِ صالح کے ضمن میں قومی، ملی اور سیاسی زندگی سے متعلق قرآن حکیم کی جامع ترین سورہ کے مقام کی حامل ہے۔ سورۃ العصر میں جو اس منتخب نصاب کی اساس ہے، نجات اُخروی کی جن چار ناگزیر شرائط کا بیان ہے یعنی (۱) ایمان۔ (۲) عملِ صالح (۳) تواصی بالحق اور (۴) تواصی بالصبر۔ تو سورہ حج کے آخری رکوع سے تواصی بالحق کے مباحث شروع ہوتے ہیں۔ اسی تواصی بالحق ہی کے لیے قرآن مجید میں متعدد اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں۔ جیسے جہاد فی سبیل اللہ۔ شہادت علی الناس۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر، اظہار دین الحق، اقامتِ دین، تکبیرِ رب ــــ اسی عمل کا ذروۂ سنام یا نقطۂ عروج ہے قتال فی سبیل اللہ۔

لہٰذا "شامِ الہدیٰ" کی دوسری نشست میں محترم ڈاکٹر صاحب نے سورہ حج کے آخری رکوع کے درس سے ان مباحث کا آغاز فرمایا۔ یہ رکوع چھ آیات پر مشتمل ہے۔ اس کی پہلی چار آیات میں پوری نوعِ انسانی کو یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ کے الفاظ سے خطاب ہے جس میں قرآن کی اساسی دعوت یعنی دعوتِ ایمان کا خلاصہ "کوزے میں سمندر" کے مصداق آجاتا ہے اور آخری دو آیات میں خطاب یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے الفاظ سے ہوتا ہے جس میں اُس "دعوتِ عمل"

کا خلاصہ آجاتا ہے جس کا مطالبہ قرآن حکیم ہر اُس شخص سے کرتا ہے، جو ایمان کا مدّعی ہو یعنی دعوتِ ایمان کو قبول کرنے کا اعلان و اعتراف کرے ——
دو گھنٹے کے درس میں صرف پہلی چار آیات کا بیان ہی مکمل ہو سکا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے فرمایا کہ بقیہ دو آیات کا درس ان شاء اللہ آئندہ نشست میں ہوگا۔ دو گھنٹے کے اس درس کے دوران شاید ہی کوئی شخص ایسا ہو جس نے کرسی یا فرشی اپنی نشست چھوڑی ہو۔

پہلی نشست میں سورہ حجرات کو ایک بڑے اسکرین پر سلائیڈ کے ذریعے دکھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ پچھلی نشستوں پر تشریف فرما حضرات اور گیلری میں خواتین کو اسکرین پر سورہ مبارکہ کے پڑھنے میں شدید دقت پیش آئی تھی۔ اس کا ازالہ اس مرتبہ اس طرح کیا گیا کہ سورہ حج کے آخری رکوع کا متن اور منتخب نصاب میں اس کے متعلق تحریر شدہ نکات پر مشتمل آٹھ صفحات کا پمفلٹ "بزمِ احبابِ الہدیٰ" کی جانب سے طبع کرا کے شرکاء میں تقسیم کر دیا گیا۔ جس کی بدولت ان کو یہ سہولت حاصل ہو گئی تھی کہ وہ درس کے ساتھ ساتھ متن کو بھی پیشِ نظر رکھ سکتے تھے۔

درس کے اختتام پر ہوٹل کے Basement میں واقع مسجد میں محترم ڈاکٹر صاحب کی اقتداء میں نمازِ عشاء باجماعت ادا کی گئی۔ موصوف نے اختتام پر اعلان فرما دیا تھا کہ نماز کے بعد آڈیٹوریم ہی میں آج کے درس کے متعلق سوال و جواب کی نشست ہوگی۔ اس مقصد کے لیے سورہ حج کے متن کے ساتھ ہی سوال لکھنے اور اپنا نام و پتہ درج کرنے کے لیے فارم بھی بزم کی طرف سے شرکاء میں تقسیم کر دیے گئے تھے۔

سوا نو بجے شب کے قریب سوال و جواب کی نشست منعقد ہوئی جس میں قریباً پانچ سو حضرات شریک رہے —— جو متعدد سوالات فقہی نوعیت کے تھے، اُن کے جواب سے محترم ڈاکٹر صاحب نے معذوری کا اظہار فرمایا۔ درس سے متعلق بھی کافی سوالات تھے جن میں سے سب کے موصوف نے شافی اور تسلّی بخش جوابات دیے۔ یہ نشست قریباً پون گھنٹے تک جاری رہی۔ اور دس بجے شب بحمد اللہ

اختتام پذیر ہوئی۔

حسب سابق اس درس اور سوالات وجوابات کے عام کیسٹ اور وڈیو کیسٹ بھی تیار کیے گئے جو نشر القرآن کیسٹ ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن لاہور نمبر ۱۴۔ اور شائننگ ٹریڈرز رفیع مینشن بالمقابل آرام باغ شاہراہِ لیاقت کراچی سے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

دسمبر ۸۴ء کی آخری سوموار ۳۱ تاریخ کو پڑ رہی تھی لیکن چونکہ قرآن اکیڈمی میں یکم دسمبر ۸۴ء سے ۱۰ جنوری ۸۵ء تک چالیس روزہ ایک تربیتی پروگرام کا آغاز ہو رہا تھا جس میں محترم ڈاکٹر صاحب کو روزانہ درس قرآن اور تنظیم اسلامی کی دعوت پر مشتمل تالیفات پر لیکچرز دینے تھے لہٰذا اس دوران موصوف کا لاہور سے کراچی تشریف لانا مشکل تھا۔ چنانچہ نشست کے اختتام سے قبل ہی ڈاکٹر صاحب نے اعلان فرمایا کہ دسمبر کی آخری سوموار کی "شامِ الہدیٰ" کا انعقاد نہیں ہو سکے گا۔ اس کی تلافی کی صورت یہ ہو گی کہ ان شاء اللہ جنوری ۸۵ء کی آخری سوموار کو جو نشست منعقد ہو گی، وہ مسلسل تین دن تک جاری رہے گی۔ پہلی نشست میں سورہ حج کی بقیہ دو آیات کے درس کی تکمیل ہو گی اور دوسرے اور تیسرے دن یعنی دو نشستوں میں سورہ الصف کا درس مکمل ہو گا۔

تاج محل کی انتظامیہ سے اس کارِ خیر کے لیے مسلسل تین دن تک آڈیٹوریم استعمال کرنے کی منظوری حاصل کر لی گئی تھی جس کے لیے محترم ڈاکٹر صاحب نے ہوٹل کی انتظامیہ کے لیے ہدیہ تبریک و تشکر پیش کیا۔

لہٰذا ماہنامہ میثاق کے کراچی کے قارئین سے التماس ہے کہ وہ نوٹ فرمالیں کہ ان شاء اللہ العزیز "شامِ الہدیٰ" کی تین نشستیں ۲۸، ۲۹ اور ۳۰ جنوری ۸۵ء، دوشنبہ (پیر) سہ شنبہ (منگل) اور چہار شنبہ (بدھ) کو بعد نمازِ مغرب ساڑھے چھ بجے تاج محل ہوٹل میں منعقد ہوں گی۔ نشست کی یقینی دستیابی کے لیے مناسب

ہوگا کہ نمازِ مغرب کی ادائیگی کا اہتمام ہوٹل کے
BASEMENT کی مسجد میں کیا جائے۔

قرآن حکیم کے علوم و معارف اور اس کے اعجازات سے واقفیت حاصل کرنے کا جو ذوق و شوق کراچی کے تعلیم یافتہ افراد میں پروان چڑھ رہا ہے اور محترم ڈاکٹر صاحب کے نہایت مدلل و پُر تاثیر اسلوبِ خطاب سے جن قلوب میں قرآن حکیم کے انقلابی فکر کی تفہیم کا جو شغف روز افزوں ہے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ موتی محل آڈیٹوریم بھی، جس سے وسیع شاید ہی پاکستان میں کوئی دوسرا آڈیٹوریم ہو ۔ ناکافی ثابت ہو رہا ہے۔ اور توقع ہے کہ ان شاء اللہ العزیز آئندہ "شامِ الہدیٰ" کی نشستوں میں اس نشست میں شریک ہونے والے افراد کے مقابلے میں آئندہ تشریف لانے والے افراد کی تعداد کہیں زیادہ ہوگی۔ لہذا یہ انتظام پیشِ نظر ہے کہ تاج محل ہوٹل کی انتظامیہ سے درخواست کی جائے کہ وہ ہوٹل کا دوسرا ہال جو "تاجی ہال" کے نام سے موسوم ہے اور جہاں آٹھ سو نشستوں کا انتظام بہ آسانی ہو سکتا ہے۔ اس کارِ خیر کے لیے عنایت فرما دیں۔ ہمیں پوری امید ہے کہ ان شاء اللہ ہوٹل کی انتظامیہ اس درخواست کو ضرور منظور کر لے گی اور بزم کے ساتھ تعاون کرے گی۔ اس ہال میں ٹیلی ویژن یا بڑی اسکرین پر موتی محل کے پروگرام کو براہِ راست ریلے کرنے کا انتظام کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ مدرس، خطیب، مقرر آنکھوں کے سامنے موجود ہو تو اثر پذیری میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی تائید سے یہ انتظامات پایۂ تکمیل کو پہنچ گئے تو "تاجی ہال" میں تشریف فرما حضرات نہ صرف درس سُن سکیں گے بلکہ اسکرین پر وہ محترم ڈاکٹر صاحب کو درس دیتے ہوئے دیکھ بھی سکیں گے اور جگہ نہ ملنے کے باعث کسی کو بھی ناچار واپس جانے کا ان شاء اللہ موقع نہیں آئے گا۔

بید اللہ التوفیق وعلیہ التکلان

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

رفتارِ کار

امیرِ تنظیمِ اسلامی کا دورۂ ملتان و بہاولنگر

۶ نومبر ۱۹۸۴ء : امیرِ تنظیم آج عرصہ ۸ ماہ بعد ملتان تشریف لا رہے تھے۔ جون میں ماہِ رمضان کی وجہ سے اور پھر فوراً بعد بیرونِ ملک دورے کی بنا پر ہم انہیں مدعو نہ کر سکے۔ اکتوبر میں تاریخ تقریباً طے ہو چکی تھی لیکن ان کی علالت کی بنا پر یہ دورہ منسوخ کر دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے جب طبیعت سنبھلی تو انہوں نے خود ہی ۶ نومبر کی تاریخ ہمارے لئے متعیّن کر دی۔ ۲ ½ بجے جب جہاز ائرپورٹ پر اترا تو ملتان کے امیرِ تنظیم جناب ترین صاحب اور راقم ان کے استقبال کے لئے موجود تھے۔ مصافحہ اور معانقہ کے بعد ہم ۵/۲ آفیسرز کالونی روانہ ہوئے۔ جہاں بعد از نمازِ عشاء جلسہ ہونا تھا۔ امیرِ تنظیم نے رفقاءِ تنظیم سے ملاقات کی اور عصر و مغرب کی نماز انہیں کے ساتھ ادا کی۔ بعد نمازِ عشاء امیرِ تنظیم نے "جہاد بالقرآن" کے موضوع پر نہایت جامع خطاب کیا۔ ان سے پہلے امیرِ ملتان نے تلاوت کی اور ترجمہ پیش کیا۔ لگ بھگ ۲ صد افراد نے پورے انہماک کے ساتھ یہ خطاب سنا۔

۷ نومبر ۱۹۸۴ء : ۸ ½ بجے سوال و جواب کی نشست شروع ہوئی جس میں انقلاب اور دوسرے موضوعات پر تحریری شکل میں سوالات پوچھے گئے جن کے نہایت مناسب اور مدلّل جوابات دیئے گئے۔ اس کے بعد چار اشخاص نے امیرِ تنظیم کے ہاتھ پر جہاد کی بیعت کی۔ اللہ تعالیٰ ان کے اس عزمِ مصمّم کو قائم رکھے اور دین کی خدمت کرنے کی توفیق بخشے۔ (آمین)

بارہ بجے کھانے سے فارغ ہو کر دو کاروں پر مشتمل مختصر سا قافلہ بہاولنگر کی جانب روانہ ہوا۔ عصر کی نماز راستے میں ادا کی۔ اور مغرب تک بہاولنگر پہنچ گئے۔ وہاں جناب نعیم صاحب اور سخی چشتی صاحب نے، جو رفقاء میں سے ہیں ہمارے استقبال کے لئے موجود تھے۔ ان دونوں صاحبان نے نہایت محنت اور جانفشانی سے جلسے کا انتظام کیا ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کی محنتوں کو قبول فرمائے (آمین)۔ بہاولنگر کی رپورٹ جناب نعیم الدین احمد صاحب کے قلم سے ملاحظہ فرمائیں۔

ڈاکٹر محمد طاہر خاکوانی، قیمِ تنظیمِ اسلامی، ملتان

بہاولنگر

اہلِ بہاولنگر کی یہ دیرینہ خواہش تھی کہ جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب بہاولنگر کا دورہ فرمائیں اور پھر ہماری کوششوں سے ۷ اکتوبر ۸۴ء کی تاریخ طے پائی مگر شاید یہ اللہ کو منظور نہ تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی علالت کے باعث اس پروگرام کو ملتوی کرنا پڑا اور پھر پورے ایک ماہ بعد ۷ نومبر ۸۴ء کا پروگرام طے ہوا۔ راقم اس ضمن میں ۲۴ اکتوبر ۸۴ء کو بہاولنگر چلا گیا اور جلسہ کے انتظامات کے سلسلے میں ضروری اقدامات کئے جس میں جگہ کا انتخاب، ڈپٹی کمشنر سے جلسہ کی اجازت، لوگوں کو پروگرام سے آگاہ کرنا شامل تھا۔ ضلعی قانون کے مطابق ہمیں لاؤڈ سپیکر کے ذریعے اعلان کرنے کی اجازت نہ مل سکی۔ لہٰذا راقم نے اپنے تئیں ایک طریقہ اختیار کیا وہ یہ کہ ایک دوست کے ہاں سے بذریعہ ٹیلی فون شہر کے تمام شرفاء کو مطلع کر دیا (شہر زیادہ بڑا نہیں ہے اس لئے یہ کام چار پانچ گھنٹے میں انجام پا گیا) اس کے علاوہ وہاں مقیم

احباب اور اپنے چھوٹے بھائیوں کے ذمے لوگوں سے رابطہ کا کام سونپ کر واپس لاہور آگیا۔

امیر محترم کا پروگرام اس طرح سے تھا کہ مورخہ چھ نومبر ۸۴ء کو ملتان تشریف لے جائیں گے وہاں بعد نماز عشاء "جہاد القرآن" کے موضوع پر خطاب فرمائیں گے اور سات تاریخ کو صبح آٹھ بجے سوالات کے جوابات دیں گے۔ اور سات تاریخ کو ہی عصر تک جناب غلام حیدر ترین صاحب اور ملتان کے دیگر رفقاء کے ہمراہ ایک چھوٹے سے قافلے کی صورت بہاولنگر پہنچیں گے۔ لہٰذا راقم چھ نومبر ۸۴ء کی صبح بہاولنگر پہنچ گیا اور سب سے پہلے بہاولنگر کے رفیق جناب سخی چشتی صاحب سے ملاقات کی انہوں نے جائے جلسہ پر ضروری انتظامات کی ذمہ داری قبول فرمائی جو کہ شہر کی بڑی مسجد ریلوے جامع مسجد طے پایا۔ یہاں میں یہ ذکر ضروری سمجھتا ہوں کہ وہاں ہمارے پروگرام کو کامیاب بنانے میں سب سے زیادہ حصہ ریلوے جامع مسجد کے خطیب جناب مولانا عبدالحفیظ صاحب کا ہے۔ انہوں نے نہ صرف ڈاکٹر صاحب کی آمد پر نہایت خوشی اور سرگرمی کا اظہار فرمایا بلکہ اپنے طور پر ضلع کے سرکاری افسران سے رابطہ کر کے انہیں جلسہ میں شرکت کی دعوت دی اور اس طرح سے انہوں نے جلسہ کی رونق میں بے حد اضافہ فرمایا۔ بہرحال میں ذاتی طور پر ان کا بے حد مشکور ہوں۔ علاوہ ازیں بہاولنگر کے ممتاز شہری اور علاقہ کے بڑے زمیندار جناب سید محمد زمان شاہ صاحب جن کے ساتھ دیرینہ تعلقات ہیں نے ڈاکٹر صاحب کے دورۂ بہاولنگر کے سلسلے میں نہ صرف ہمارے ساتھ تعاون فرمایا بلکہ ہمہ وقت ہمارے ساتھ رہ کر ہماری عزت افزائی فرمائی۔

بہرحال انتظار کی گھڑیاں کس قدر کٹھن ہوتی ہیں اس کا اندازہ سات نومبر ۸۴ء کو عصر و مغرب کے درمیان اس وقت ہوا جب راقم اپنے کرم فرماؤں جناب محمد زمان شاہ صاحب، ڈاکٹر طفیل احمد صاحب (راقم کے چچا) جناب سخی چشتی صاحب اور دوسرے دوست احباب کے ساتھ امیر محترم کا نہایت شدت سے شہر کے باہر انتظار کر رہا تھا۔ آخر کار مغرب سے پندرہ منٹ قبل امیر محترم کا دو کاروں پر مشتمل قافلہ بہاولنگر پہنچا۔ جناب محمد زمان شاہ صاحب نے اپنی عالی شان کوٹھی پر چائے کا انتظام کر رکھا تھا۔ وہاں معزز مہمانوں نے چائے نوش فرمائی اور مغرب کی اذان کے دوران ہی ریلوے جامع مسجد پہنچ گئے جہاں مولانا عبدالحفیظ صاحب بڑی بے تابی سے ڈاکٹر صاحب کے منتظر تھے۔

نماز مغرب کے بعد ٹھیک چھ بجے ڈاکٹر صاحب نے "ہماری دینی ذمہ داریاں" کے موضوع پر ڈھائی گھنٹہ کا نہایت ہی مدلل اور روح پرور خطاب فرمایا۔ جلسہ میں حاضری تقریباً ۱۲ سو کے لگ بھگ تھی جن میں کالج کے اساتذہ ضلع کے بڑے افسران اور معززین شہر نے شرکت فرمائی۔ علاقہ کے علماء حضرات بھی خاصی تعداد میں تشریف لائے تھے۔ بہرحال اس طرح سے یہ بہاولنگر کی تاریخ کا سب سے بڑا دینی جلسہ قرار پایا اور ڈاکٹر صاحب نے اپنے فصیح و بلیغ بیان کے ذریعے اہل بہاولنگر کے دلوں پر گہرے نقوش چھوڑے۔

بعد ازاں امیر محترم مہمان رفقاء اور شہر کے دیگر معززین اور میرے دوستوں کے ہمراہ چھ سات کاروں اور اتنے ہی موٹر سائیکلوں کے قافلہ کی صورت میں راقم کے غریب خانہ پر تشریف فرما ہوئے۔ وہاں رات کا کھانا تناول فرمایا اور پھر محمد زمان شاہ صاحب کے ہمراہ ان کی کوٹھی تشریف لے گئے کیونکہ موصوف کا اصرار تھا کہ امیر محترم ان کے ہاں رہنے کی سعادت سے نوازیں۔ بہرحال صبح بعد نماز فجر ناشتہ کی نشست بھی ریلوے جامع مسجد میں منعقد کی گئی جس میں نہایت اچھے سوالات پوچھے گئے جن کا جواب ڈاکٹر صاحب نے اپنے مخصوص عالمانہ اور دلچسپ انداز میں دیا اور سائلین کو مطمئن فرمایا۔ ناشتہ پر جناب سخی چشتی صاحب نے مدعو کیا تھا اور ٹھیک دس بجے ڈاکٹر صاحب نے وکلاء کے اصرار پر بار کونسل میں "استحکام پاکستان کے موضوع پر ایک تاریخی

خطاب کیا جس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے وکلاء کے چند سوالات کا جواب بھی دیا اور پھر ٹھیک ساڑھے بارہ بجے ڈاکٹر صاحب ملتان کے رفقاء کے ہمراہ بہاولنگر سے ایک کامیاب دورہ کے بعد واپس تشریف لے گئے اور یوں اہل بہاولنگر کی ایک دیرینہ خواہش پوری ہوئی۔ لیکن مزید خواہش کا پیش خیمہ بھی بنی کہ ڈاکٹر صاحب اس چھوٹے سے شہر کو ایک مرتبہ پھر پذیرائی بخشیں اور انہیں ایک عظیم سکالر کی میزبانی کا شرف حاصل ہو۔ خداوند تعالیٰ ہم سب کو اپنے نیک مقاصد میں کامیاب فرمائے آمین۔ میں اس سلسلے میں ان حضرات کا تہ دل سے مشکور ہوں جنہوں نے اس پروگرام کو کامیاب بنانے میں میرا بھرپور ساتھ دیا۔ خدا انہیں اجر عظیم سے نوازے آمین۔

راقم: نعیم الدین احمد، منیجر مکتبہ انجمن و تنظیم

امیر تنظیم کا دورۂ کوئٹہ

پروگرام کے مطابق امیر تنظیم اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مؤرخہ ۱۲ نومبر دوپہر ایک بجے بخیریت کوئٹہ پہنچے۔ رفقاءِ تنظیم اور کچھ عقیدت مند ہوائی اڈے پر استقبال کے لئے موجود تھے۔ راقم کی خوش قسمتی ہے کہ اس دفعہ ڈاکٹر صاحب کوئٹہ کے دورہ کے دوران راقم کے غریب خانہ پر رہائش پذیر رہے۔

ڈاکٹر صاحب کو کچھ عرصہ سے کمر میں درد تھا۔ کوئٹہ پہنچتے ہی کمر کی تکلیف نے شدت اختیار کر لی۔ علالت کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کی مصروفیات کا دائرہ محدود کرنا پڑا۔ اور کچھ عقیدت مندوں کی طرف سے دی گئی دعوتوں کو منسوخ کرنا پڑا۔

باوجود کمر کی تکلیف کے اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل و کرم سے طے شدہ پروگرام کے مطابق سورۂ تغابن کا درس مکمل ہوا۔

دورۂ کوئٹہ کے دوران امیر محترم کی مصروفیات مندرجہ ذیل رہیں:

۱۲ نومبر: بعد نماز عصر تا مغرب: تنظیم اسلامی کوئٹہ کے دفتر میں رفقاءِ تنظیم اور مختلف لوگوں کے ساتھ تبادلۂ خیالات ہوا۔

——— بعد نماز مغرب تا عشاء: پروگرام کے مطابق مسجد طوبیٰ میں سورۂ تغابن کی آیات ایک تا دس کا درس ہوا جو دو گھنٹے تک جاری رہا۔ جس میں امیر محترم نے قرآنی آیات کی روشنی میں مندرجہ ذیل مضامین پر روشنی ڈالی۔

۱۔ کائناتِ ارضی و سماوی کا ذرہ ذرہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتا ہے۔ اس کا مفہوم؟ ۲۔ ذات و صفاتِ باری تعالیٰ ۳۔ تخلیق بالحق سے آخرت پر استدلال ۴۔ نبوت اور شریعت میں استبعاد سے پیدا شدہ دو گمراہیاں ۵۔ اثباتِ بعث بعد الموت ۶۔ ایمان کی پرزور دعوت ۷۔ کامیابی و ناکامی اور ہار جیت کا اصل معیار

رفقاءِ تنظیم کی محنت اور اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل و کرم کی بدولت کافی تعداد میں لوگوں نے درس میں شرکت کی۔

۱۳ نومبر: امیر محترم کے ساتھ بلوچستان کے ایک معروف عالم دین مولانا منیر الدین صاحب کی صبح ۸ بجے تا ۱۰ بجے

——— ایک نشست ہوئی جس میں خصوصی طور پر مسلمانوں کی دینی ذمہ داریاں زیر بحث رہیں۔ یہ نشست کافی معلوماتی اور دینی نقطۂ نظر سے اہم رہی۔

بعد نمازِ ظہر تا عصر: کوئٹہ سے تعلق رکھنے والے کچھ علماء اور مختلف کالجوں کے اسلامیات کے اساتذہ سے امیرِ محترم کی تعارفی نشست ہوئی۔ یہ نشست کافی کامیاب رہی اور تجربہ کے لحاظ سے معلوماتی بھی۔

بعد نمازِ مغرب تا عشاء: پروگرام کے مطابق سورہ تغابن کی بقیہ آیات کا درس مکمل کیا گیا۔ جس میں حسب ذیل حکیمانہ، ایمان افروز اور جذبہ انگیز مضامین پر روشنی ڈالی گئی۔

۱۔ ثمراتِ ایمان: تسلیم و رضا، اطاعت و انقیاد، توکل علی اللہ

۲۔ اہل و عیال کی محبت میں مضمر خطرہ ۳۔ مال اور اولاد کی فتنہ انگیزی ۴۔ سمع و طاعت اور

۵۔ انفاق فی سبیل اللہ۔

نمازِ عشاء کے بعد سوال و جواب کی نشست ہوئی۔ جو رات دس بجے اختتام کو پہنچی۔

۱۴ نومبر: صبح ۸ بجے تا دس بجے مولانا منیر الدین صاحب سے امیرِ محترم کی ایک اور نشست ہوئی جس میں دینی نقطہ ——— نظر سے بہت سے اہم سوالات زیرِ بحث رہے۔ مولانا منیر الدین صاحب سے دو تفصیلی ملاقاتوں کے بعد امیرِ محترم کے تاثرات یہ ہیں کہ کوئٹہ میں قیام کے دوران ایک عالمِ حق سے دینی امور کے سلسلہ میں تبادلۂ خیالات اور ملاقات میرے لئے بہت اہمیت کی حامل رہی۔

کوئٹہ سے لاہور روانگی سے پہلے امیرِ محترم نے رفقاءِ تنظیم اسلامی کو ضروری نصیحتیں فرمائیں۔ تنظیم اسلامی کے مقاصد کو سمجھتے ہوئے چھ حضرات نے دینی ذمہ داریاں نبھانے کے لئے عہد کیا اور امیرِ محترم کے ہاتھ پر بیعت کی۔

تقریباً ایک بجے آپ کوئٹہ سے لاہور کے لئے روانہ ہو گئے۔ اس طرح امیرِ محترم کا یہ مختصر دورۂ کوئٹہ اختتام پذیر ہوا۔ امیرِ موصوف کے دورہ سے رفقاءِ تنظیم کو اپنی ذمہ داریاں نبھانے کے لئے ایک نیا جذبہ اور جوش ملا ——— آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ امیرِ محترم کو صحتِ کاملہ عطا فرمائے تاکہ اللہ کے دین کو پھیلانے اور اسے قائم کرنے کے سلسلہ میں مزید رہنمائی میسر آتی رہے۔

اشفاق احمد میر
قیم تنظیم اسلامی، کوئٹہ

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافہ اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقہ کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

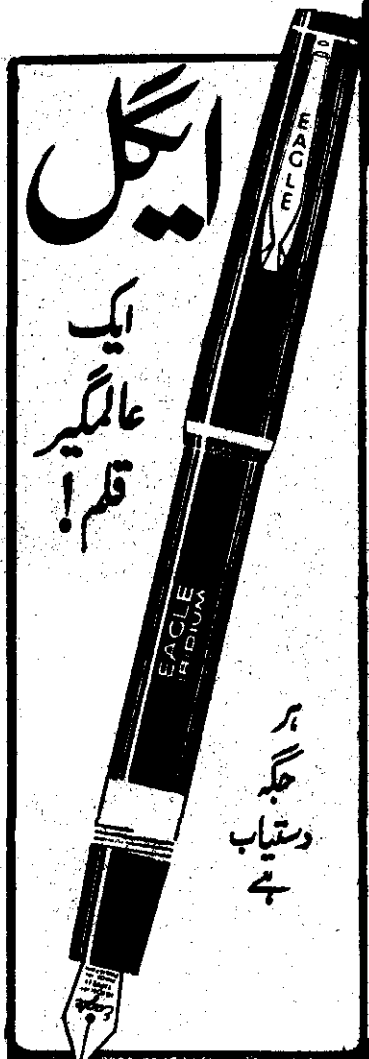

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور

کی مطبوعات میں

ایک اہم اضافہ

★

سانحۂ کربلا

ڈاکٹر اسرار احمد

کی ایک اہم تقریر جس کا پہلا
ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گیا تھا،
دوسرا ایڈیشن شائع ہو گیا ہے۔

صفحات — ۴۸

قیمت : ۳ روپے صرف

ملنے کا پتہ

۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور

فون ٨٥٢٠٠١١

ایگل

ایک
عالمگیر
قلم!

ہر
جگہ
دستیاب
ہے

A PRODUCT OF
AZAD FRIENDS & CO. LTD.

AFC-8/74 Crescen

THE ORIGINAL
Have a Coke and a smile.
"COCA-COLA" AND "COKE" ARE REGISTERED TRADE MARKS WHICH IDENTIFY THE SAME PRODUCT OF THE COCA COLA COMPANY.
paragon

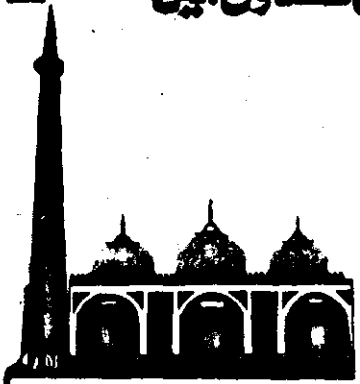

پاکستان کی کھلی فضاؤں میں
پاکستان کی
کھلی فضاؤں میں
اذانوں کی گونج
عبادت نوحالت حیات
کی آئینہ دار ہے
اور
مشینوں کے چلتے ہوئے پہیوں کا شور
ہماری صنعتی ترقی کا مظہر ہے
ملکی صنعت قوم کی خدمت ہے اور قومی خدمت ایک عبادت ہے
سروس اپنے شوز کی ایکسپورٹ سے زرمبادلہ کما کر دن رات
وطنِ عزیز
کی خدمت میں سرگرم عمل ہے
سروس شوز۔ دُنیا کے گوشے گوشے میں مقبول

امپورٹ۔ ایکسپورٹ کا قابلِ فخر ادارہ

ربن بو۔ انٹرنیشنل

فون: ۳۰۳۳۵۵
۳۰۳۳۷۷

برآمدی اشیاء

آرٹ سلک فیبرکس گارمنٹس ✣ بیڈ شیٹس
کاٹن کلاتھ ✣ کاٹن گارمنٹس ✣ احرام تولیہ ✣ تولیہ
ہینڈی کرافٹس ✣ لکڑی کا فرنیچر۔

درآمدی اشیاء

لاکھ دانہ ✣ سٹکر فلم ✣ سوچ سٹارٹر
ریڑ بیٹکس ✣ پولیسٹر ریان۔

مرکزی دفاتر

II فلور غلام رسول بلڈنگ ۶۰ شاہراہ قائداعظم لاہور

ذیلی دفاتر:۔ کراچی ــ فیصل آباد

وَأَنزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ

(الحدید: ۲۵)

اور ہم نے لوہا اتارا

جس میں جنگ کی بڑی قوت ہے

اور لوگوں کے لیے بڑے فوائد بھی ہیں۔

اتفاق فاؤنڈریز لمیٹڈ

۳۲- ایمپریس روڈ - لاہور

پنجاب بیوریجز کمپنی لمیٹڈ۔ فیصل آباد۔ فون: ۲۶۰۳۱ / ۲۳۹۳۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سانیو

SANYO

AIRCONDITIONERS
REFRIGERATORS &
FREEZERS

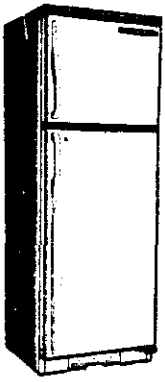

NO-FROST REFRIGERATORS

with exclusive features

- Two door with built-in lock.
- Spacious freezer compartment with drainage system, a new feature.
- Indicator pilot light on front door.
- In 4 pleasing colours (Green, Gold, Almond and White).
- One Year free service and 5 Years Guarantee on Compressor.

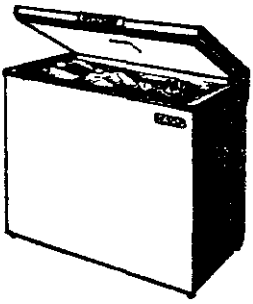

CHEST/UPRIGHT FREEZERS

AIR-CONDITIONERS

new in utility
with higher efficiency

Capacity: 1½ Ton, 18000 BTU/h
Noiseless Operation.
Trouble Free Service. Auto Deflector (Swing System).
Brown Teak Wood finish Grill.

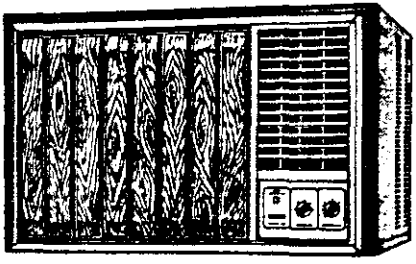

Available at all SANYO Authorised Dealers

MANUFACTURED/ASSEMBLED IN PAKISTAN

SPECIAL ATTENTION: Please ensure that you get your Worldwide Trading Company's *5 year Guarantee Certificate in order to avail free after* Sales Service.

SOLE AGENTS IN PAKISTAN FOR ALL SANYO PRODUCTS

WORLDWIDE TRADING CO.

(SANYO CENTRE)
GARDEN ROAD, SADDAR, KARACHI. PHONES: (PABX) 525151-55 (5 Lines)
CABLE: "WORLDBEST" TELEX: 25109 WWTCO PK

786/WW 109/83

آوازِ اخلاق

وقت ایسی زمین ہے جس میں محنت کے بغیر کچھ نہیں پیدا ہوتا۔

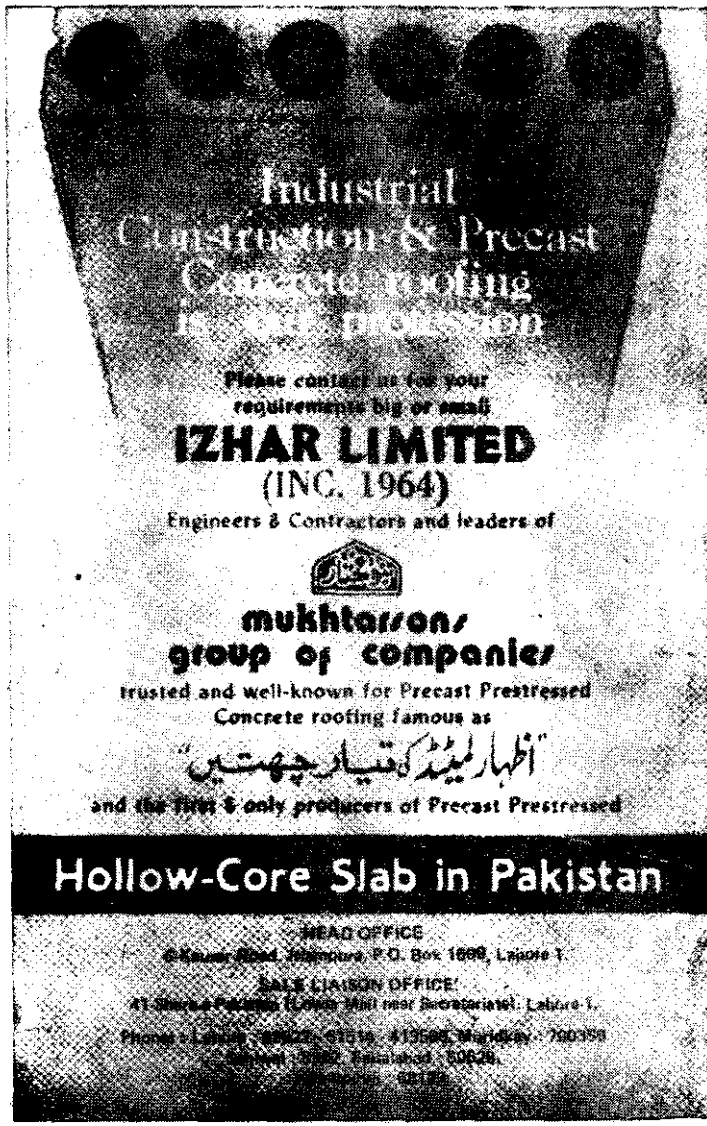
Industrial
Construction & Precast
Concrete Roofing
Please contact us for your
requirements big or small
IZHAR LIMITED
(INC. 1964)
Engineers & Contractors and leaders of
mukhtarsons
group of companies
trusted and well-known for Precast Prestressed
Concrete roofing famous as
"اظہار لمیٹڈ کی تیار چھتیں"
and the first & only producers of Precast Prestressed
Hollow-Core Slab in Pakistan
HEAD OFFICE
SALES LIAISON OFFICE:

ٹینٹ اور ترپال

بنانے کا
ممتاز ادارہ

ایچ نظام دین
اینڈ سنز

مرکزی دفتر

محمد بن قاسم روڈ۔ کراچی

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کی مطبوعات میں ایک مزید اہم اضافہ

معراج النبی ﷺ

علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام

کے موضوع پر

ڈاکٹر اسرار احمد

کا ایک اہم خطاب کتابی شکل میں شائع ہو گیا ہے

جس میں موصوف نے اس محیر العقل واقعہ کو قرآن مجید اور

احادیث شریف نیز عقلی استدلال سے واضح و مبرہن کیا ہے

عمدہ آفسٹ پیپر۔ اعلیٰ طباعت۔ صفحات ۴۰

قیمت ـــــ فی نسخہ تین روپے ـــــ (علاوہ محصول ڈاک)

ملنے کا پتہ

(۱) مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن، لاہور ۱۴

(۲) مکتبہ تنظیم اسلامی ۱۱ داؤد منزل نزد آرام باغ کراچی

الہدیٰ
کیسٹ سیریز

ڈاکٹر اسرار احمد (امیر تنظیم اسلامی)
کے مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب پر مشتمل

درسِ قرآن

کے ۳۰ کیسٹس سی T-D-K 60 جاپانی
کیسٹ پر ریکارڈ کروائے گئے ہیں جس کی قیمت
-/900 روپے ہے۔ لاہور سے باہر رہائش
پذیر خواہش مند حضرات -/910 روپے بذریعہ بنک
ڈرافٹ / منی آرڈر نشر القرآن کے نام درج ذیل
پتہ پر بھجوا کر کیسٹس حاصل کر سکتے ہیں۔

نشر القرآن کیسٹ سیریز | تنظیم اسلامی

۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور ۱۴
فون: ۸۵۲۶۱۱

سب آفس: ۱۱ داؤد منزل نزد آرام باغ، شاہراہ لیاقت کراچی
کراچی فون برائے رابطہ: ۲۱۴۷۰۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلحَمدُ لِلّٰہ

ایک اور اعزاز

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے گزشتہ سالوں کی طرح ۱۹۸۲-۸۳ کے دوران
بھی ہماری بہترین برآمدی کارکردگی اور وطن عزیز کے لیے کثیر زرمبادلہ کمانے پر فیڈریشن آف
پاکستان چیمبرز آف کامرس اینڈ انڈسٹری کی جانب سے ہم ایک بار پھر

بہترین برآمدی کارکردگی کی ٹرافی

کے مستحق قرار پائے

یہ ٹرافی جناب جنرل محمد ضیاء الحق صاحب صدر پاکستان نے ایک پُروقار تقریب میں اپنے ہاتھوں سے ہمیں عطا فرمائی۔

ہمیں خیمے، ترپالیں اور کینوس کی دیگر مصنوعات کے سب
سے بڑے برآمدکنندگان ہونے کا بجا طور پر شرف حاصل ہے۔

SNDS

حاجی شیخ نورالدین اینڈ سنز لمیٹڈ

پاکستان میں کینوس مصنوعات کے سب سے بڑے برآمدکنندگان

ہیڈ آفس: حفیظ چیمبرز، ۸۵، شاہراہ قائد اعظم، لاہور (پاکستان)
فون: ۳۰۶۴۶۸ - ۳۰۵۴۶۹، تار: شاہی خیمہ ٹیلکس: 44543 NOOR PK
ایگزیکٹو آفس: ۶۱۶-۶۱۴ کامرس سینٹر، چھٹی منزل، حسرت موہانی روڈ۔ کراچی (پاکستان)
فون: ۲۱۳۵۴۰ - ۲۱۴۳۸۷، تار: 'TARPAULIN' ٹیلکس: 25480 NOOR PK

Regd. L. No. 7360

MONTHLY "MEESAQ" LAHORE

Vol. 34 | JANUARY 1985 | No. 1

قدرتی گیس کا ضیاع روکیئے

ہمارے توانائی کے وسائل محدود ہیں۔ ہم توانائی کے ضیاع کے متحمل نہیں ہو سکتے

گیس بچا کر
قومی معیشت کو
مستحکم بنائیے

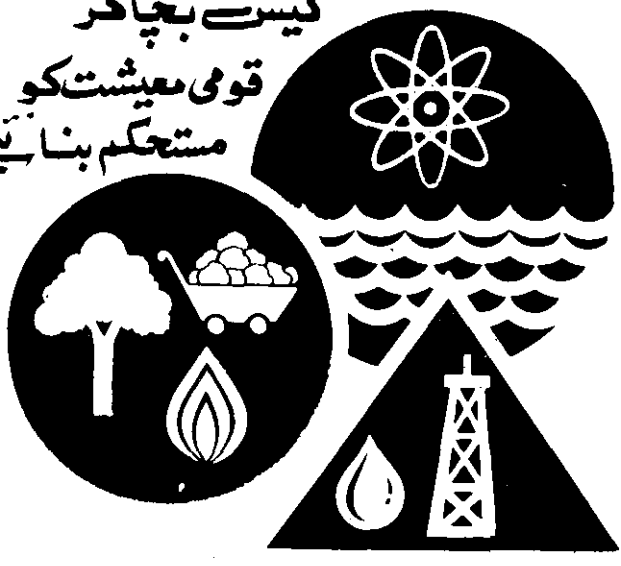

ہمارے ملک میں توانائی کے وسائل کی کمی ہے۔ توانائی کی ضروریات کثیر زرمبادلہ صرف کر کے پوری کی جاتی ہیں۔ ہماری صنعت، تجارت، زراعت کے شعبوں میں توانائی کی مانگ روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ آپ کی بچائی ہوئی توانائی ان اہم شعبوں کے فروغ میں کام آئے گی۔

قدرتی گیس بہت زیادہ قیمتی ہے۔۔
اسے ضائع نہ کیجئے

سوئی ناردرن گیس پائپ لائنز لمیٹڈ

SNGPL 4/80

paragon